# فہرست


پیش لفظ

مقدمہ

معاملات

ساتویں جلد کا موضوع معاملات ::

معاملات کے حدود ::

معاملات سے ہماری مراد ::

اس کام کا اشکال ::

دیگر مذاہب اور معاملات ::

معاملات کے ماخذ ::

قانون سازوں کی بیچارگی ::

جمہوریت کی ناکامی ::

صحیح و عادلانہ قانون سازی سے انسانیت کی ناچاری ::

قانون الٰہی کی ضرورت ::

کتاب اور میزان ::

قانون الٰہی کی دائمی یکسانی ::

فطری حقوق و معاملات کی یکسانی ::

قانون کا بنیادی تخیل ::

قانون الٰہی کی بنیاد اور اس کی عمومیت ::

ایک اصولی فرق ::

اسلام میں حکومت کی حیثیت و اہمیت ::

عہد نبوی ﷺ میں نظام حکومت

سلطنت اور دین کا تعلق

لفظ رعیت ::

سلطنت و ملکیت کی حقیقت ::

اسلام نے ملکیت کے الفاظ ترک کر دیئے ::

لفظ ملک الملوک کی ممانعت ::

امت مسلمہ کی بعثت

قوت عاملہ یا قوت آمرہ

اسلامی روایات کی دوسری بنیادی اصل

حاکم حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے

عبادت ::

www.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved
©2002-2006

# پیش لفظ

الحمد لله رب العلمین والصلوٰت والسلام علیہ سید المرسلین و خاتم النبیین محمد و آلہ و صحبہ اجمعین

سیرت النبیﷺ اب بین الاقوامی اسلامی کتب خانہ (جو صدیوں میں سیرت نبوی علی صاحبہا الصلوٰت والسلام بلکہ اسلامیات پر مختلف اسلامی ملکوں اور وہاں بولی جانے والی زبانوں میں تیار ہوا ہے) کی ایسی متاع گراں مایہ اور علمی شاہکار ہے جس کو کسی تعارف اور کسی مدح و توصیف کی اب ضرورت نہیں بلکہ اس کی انفرادیت کا اعتراف اور اس سے اپنے تاثر و عقیدت کا اظہار اپنی خوش مذاقی و وویدہ وری کا ثبوت فراہم کرنے کے مترادف ہے۔

مادح خورشید مداح خود است

حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی رحمتہ اللہ علیہ کا یہ غیر معمولی وصف ہے کہ انہوں نے سیرت کا دائرہ صاحب سیرت علیہ الف الف صلوٰۃ کی سیرت طیبہ' حالت وواقعات اور شمائل و عادات سے آگے بڑھا کر پیغام محمدی تعلیمات نبوی اور شریعت اسلامی کے تمام شعبوں تک وسیع کر دیا ہے انہوں نے پہلی دو جلدوں کے بعد جن کا اصل ڈھانچہ علامہ شبلی کے قلم اعجاز رقم کا تیار کیا ہوا ہے' دلائل و معجزات اور منصب نبوت _ عقائد' عبادات اور اخلاق) کو بھی اپنی تصنیف کے دائرے میں لے لیا اور ان عنوانات پر چار ضخیم جلدیں مرتب فرما کر بعثت محمدی اور سیرت نبویﷺ کی وسعت و جامعیت' اس کی بے خطا رہبری و رہنمائی اور ہر عہد حیات انسانی و نسل آدم کے لیئے ہدایت و سعادت کے اس سامان کو اس طرح علمی انداز میں پیش کیا اور دوسرے مذاہب اور تعلیمات سے تقابلی مطالعہ کا اہتمام کیا کہ یہ کتاب ہر ملک کی نئ تعلیم یافتہ نسل کے لیئے رشد و ہدایت کا ایک صحیفہ اور ذات نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ و السلام سے گہرے تعلق کا ایک قوی ذریعہ بن گئی۔

سید صاحبؒ کا ارادہ اخلاق کے بعد معاملات و سیاسیات پر بھی ایک ضخیم جلد مرتب کرنے کا تھا' اگر ایسا ہو جاتا تو یہ کتاب سیرت و تعلیمات نبوی پر ایک دائرہ العارف (انسائیکلو پیڈیا) کا درجہ حاصل کر لیتی' لیکن افسوس ہے کہ ان کو اس موضوع پر چند مضامین ہی کے لکھنے کی نوبت آئی تھی اور وہ اس کی تکمیل نہ کر سکے تھے کہ ان کی کتاب زندگی کا آخری ورق الٹ گیا اور وہ اس کتاب کو مکمل نہ کر سکے' لیکن انہوں نے جس پیمانہ پر اس کام کو اٹھایا تھا اور ان کے سامنے کتاب کا جو خاکہ اور منصوبہ تھا (جس کا اندازہ اس کے مقدمہ ہی سے ہو جاتا ہے) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب اگر مکمل ہو جاتی تو نہ صرف سلسلہ سیرت النبی کی تکمیل ہو جاتی بلکہ ان کے علمی اور ذہنی کمالات وسعت نظر' جامعیت' اعتدال و توازن' احتیاط و تورع' شریعت اسلامی کی روح و مزاج سے آشنائی' قدیم و جدید کی واقفیت دین کے اولین و مستند ترین ماخذ سے نہ صرف براہ راست واقفیت بلکہ ان میں اعلیٰ درجہ کی بصیرت رکھنے اور اس علمی و فکری پختگی کی بنا پر (جو اس درجہ میں ان کے بہت کم معاصرین کو حاصل ہوگی) جو چیز تیار ہوتی اس میں شریعت اسلامی اور تعلیمات نبوی کی بہتر سے بہتر نمائندگی اور ترجمانی ہوتی' افراط و تفریط سے پاک تجدد و آزاد خیالی کے ہر شائبہ سے محفوظ اور اسی کے ساتھ جمود و تنگ نظری سے بھی پوری طرح بری ہوتی اور اس میں ان صدہا سوالات کا جواب بھی ہوتا جو عصر حاضر کے ذہن اور حالات و مسائل کے مطابق کسی جامع کتاب کے نہ ہونے سے تشنہ جواب رہتے ہیں' اس عہد کے خاص حالات نے اور مغرب میں جو فلسفے وجود میں آئے اور اجتماعیات و سیاسیات کو جو اہمیت حاصل ہوئی (جس کی نظیر گذشتہ عہدوں میں نہیں ملتی) اس کے پیش نظر اس کی سخت ضرورت تھی اور یہ وقت کا ایک نہایت ضروری اور انقلاب انگیز کام ہو جاتا۔

لیکن افسوس ہے کہ انہوں نے جب اس موضوع پر قلم اٹھایا تو حیات مستعار کی تھوڑی فرصت رہ گئی تھی' قلم میں خطبات مدارس اور سیرت النبی ﷺ کی جلد سوم'

چہارم، پنجم و ششم کا زور اور آبشار علم کی روانی باقی نہیں رہی تھی، پھر بعض اسباب کی بنا پر دارالمصنفین کی وہ پرسکون فضا اور اس کے وسیع کتب خانہ سے استفادہ کا ہمہ وقت موقع اور فراغ خاطر باقی نہیں رہا تھا اور اس کتاب کا بڑا حصہ غالباً ناسازگار اور ناہموار حالات اور صحت کی غیر مستقل و غیر معتدل کیفیت میں لکھا گیا، لیکن ایک مبصر و ماہر فن اور ایک استاد و کہنہ مشق مصنف کی بات ہی الگ ہوتی ہے، وہ جس موضوع پر بھی قلم اٹھاتا ہے اس میں ایک امتیازی شان پیدا کر لیتا ہے اور اس کے اجمال میں سینکڑوں صفات کا عطر اور اس کے اشارات میں بیسیوں کتاب کا خلاصہ اور حاصل مطالعہ ہوتا ہے جس کی قدر و قیمت کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہوں نے اس موضوع پر بیسیوں کتابوں کا مطالعہ کیا ہو، اور وہ اس راہ کی مشکلات سے واقف ہوں۔

عرصہ سے سیرت النبی ﷺ کے میخانے کے میخوار اور سید صاحب کی تحریرات و تحقیقات کے عاشق اس بات کے متمنی تھے کہ معاملات پر سید صاحب کے قلم سے سیرت جلد، ہفتم کے لیئے جو متفرق مضامین و مباحث نکلے ہیں اور سنا جاتا ہے کہ وہ ان کے پرانے کاغذات میں موجود ہیں، وہ اسی حالات میں کسی طرح زیور طبع سے آراستہ ہو جاتے تو ان کو پڑھ کر سیرۃ النبی ﷺ کی چھ جلدوں کے قارئین و عشاق اپنی پیاس بجھاتے اور اپنے قلب و نظر کو روشن کرتے، خدا کا شکر ہے کہ جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب ناظم دارالمصنفین کو دوسری سعادتوں کے ساتھ اس سعادت کے حصول کا بھی موقع ملا، اور انہوں نے ان مضامین کو یکجا کر کے سیرۃ النبی ﷺ جلد ہفتم کے نام سے ایک مجموعہ میں جمع کر دیا، یہ حصہ اگرچہ (سابقہ جلدوں کے مقابلہ میں) ضخامت میں بہت کم ہے لیکن اس کی قامت کی کوتاہی کو اس کی قیمت کی بڑائی پورا کرتی ہے اور اس چھوٹی سی کتاب میں بہت سے ایسے نکتے، وسیع مطالعے کا نچوڑ اور فکر و نظر کی پختگی کے نمونے موجود ہیں جو بہت سی ضخیم کتابوں

میں نہیں ملیں گی' ان کے زمانے کے متعدد مصنفین اور تحریکوں کے قائد افراط و تفریط میں مبتلا ہوئے ہیں اور انہوں نے مغربی و مادی فلسفوں کا اثر شعوری و غیر شعوری طریقے سے قبول کرلیا ہے' اس لیئے ان کا قلم اس سلسلہ میں اور بھی زیادہ محتاط ہوگیا' اندازہ ہوتا ہے کہ ان کو خود بھی اس موضوع کی نزاکت اور اس پر قلم اٹھانے کے ذمہ داری کا شدت سے احساس تھا' اس لیئے ان کو اس میں عرصہ تک تردد رہا' مقدمہ میں فرماتے ہیں:

''اول تو ضرورت یہ ہے کہ ان مسائل کی تشریح ایسے رنگ میں کی جائے جس سے مذاق حال تسکین پا سکے' اور ان کے علاوہ جو مسائل آج ہمارے سامنے نئے ہیں ان کا حل بھی ان کے سابق نظائر کو سامنے رکھ کر سوچا جائے ان امور کی تشریح میں ہزار احتیاطوں کے باوجود قلم کے مسافر کو ایسی راہوں سے گزرنا ہوگا جن میں ہر قدم پر لغزش کا خطرہ ہے' اور خصوصًا اس لیئے کہ سیاسیات و اقتصادیات کے موجودہ متوقع سوالوں کے جوابات اور ان کے متعلقہ اصولی نظریات سے علماء کی کتابیں نصا" اکثر خالی ہیں اور ان کی روشنی کے بغیر راہ کو سلامتی سے طے کر لے جانا بہت ہی مشکل نظر آتا ہے۔''(۱)۔

آگے بڑھ کر لکھتے ہیں:

''اس جلد کے لکھنے میں اس ہیچ مدان کو سالہا سال ہچکچاہٹ محسوس ہوتی رہی اور بار ہا قلم کو آگے بڑھا بڑھا کر پیچھے ہٹانا پڑا چنانچہ کام کا آغاز ۷ جمادی الثانی ۱۳۵۸ھ کو کر دیا گیا تھا' لیکن کچھ صفحے لکھ کر چھوڑ دیا دو سال کے بعد ۲۹ رمضان ۱۳۶۰ھ کو پھر لکھنے کا تہیہ کیا' اور پھر رک جانا پڑا' ۲۴ شعبان ۱۳۶۲ھ کو پھر قلم اپنے سفر پر چلنے کو آمادہ ہوا لیکن چند ہی قدم

چل کر رک جانا پڑا اب یکم رمضان المبارک ۱۳۶۴ھ کو دوبارہ
عزم درست کے ساتھ چلنے کے تیاری ہے مگر انجام عالم
الغیب کو معلوم۔'' (۲)۔

اس مختصر کتاب میں بھی بعض ایسے اصولی مسائل آ گئے ہیں جن سے عام طور پر اس موضوع کی کتابیں خالی ہیں اور اس اجمال کو تفصیل میں لے جانے سے بعض اوقات مستقل تصانیف وجود میں آ سکتی ہیں مثلاً اس کتاب میں ''معاملات'' کی تعریف اس کے اقسام اور ان کی تاریخ خاصی بصیرت افروز اور معلومات افزا ہے میزان کی وسیع اور جامع تعریف قرآن کے تتبع اور گہرے مطالعے پر مبنی ہے' سید صاحب کے قلم سے جو اس کتاب کی تالیف کے دوران سلوک کی ارتقائی منزلیں طے کر رہے تھے۔ (جن کا تقاضا عام حالات میں نہ صرف جسمانی گوشہ نشینی و انقطاع بلکہ ذہنی عزلت اور حدت مطلب بھی ہوتا ہے) پھر ان کا جس مرکز ارشاد سے تعلق تھا وہ نہ صرف سیاست وحکومت کے مسائل سے کنارہ کش تھا بلکہ اس کو اصلاح وتربیت کے لیئے بعض اوقات مضر سمجھتا تھا' ایسی صورت میں ان کے قلم سے حکومت کے نعمت ہونے کا تذکرہ نکلنا ان کے ذہنی توازن اور اپنی شخصیت کے فکری ممیّزات کو قائم رکھنے کی دلیل ہے' وہ لکھتے ہیں:

''اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت حکومت وسلطنت اور دنیا
کی سیاست ہے' یہاں تک کہ کتاب ونبوت کی دولت کے
بعد اسی کا درجہ ہے۔ (۳)۔

(۱)۔ سیرہ النبی ﷺ جلد ۷' مقدمہ ص ۵ (۲)۔ ایضاً ص ۶ (۳)۔ مقدمہ ص ۲۳

پھر اس کے ثبوت میں قرآن کی آیات بینات جمع کر دیتے ہیں' اور یہ سیرت نبوی ﷺ کے مصنف کا قدیم شیوہ ہے' لیکن پھر ان کا عصری مطالعہ اور اسلامی تحریکات نے جو لٹریچر پیدا کیا ہے' اس کی واقفیت ان کا قلم پکڑ لیتا ہے اور ان کے قلم

سے حسب ذیل الفاظ نکلتے ہیں اور اس طرح وہ راسخین فی العلم والدین کے مسلک کی پوری ترجمانی کرتے ہیں:

''اسلام کے سارے دفتر میں ایک حرف بھی ایسا موجود نہیں جس سے یہ معلوم ہو کہ قیام سلطنت اس دعوت کا اصل مقصد اور عقائد و ایمان، شرائع و احکام اور حقوق و فرائض اس کے لیئے بمنزلہ تمہید تھے، بلکہ جو کچھ ثابت ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ شرائع اور حقوق و فرائض ہی اصل مطلوب ہیں، اور ایک حکومت صالحہ کا قیام ان کے لیئے بمنزلہ اطمینان اور سکون خاطر کا باعث ہے تاکہ وہ احکام الٰہی کی تعمیل بپا سانی کر سکیں، اس لیئے وہ عرضاً مطلوب ہے۔''(۱)۔

اور اس کی تائید کے لیئے وہ سورۂ نور کی وہ مشہور آیت نقل کرتے ہیں جس میں اللہ نے ان مسلمانوں سے جو ایمان اور عمل صالح سے متصف ہوں اور توحید اور اجتناب عن الشرک کی شرط پوری کرتے ہوں، خلافت کا وعدہ کیا ہے اور اس کی غرض اور نتیجہ دین مقبول کی پائیداری و استواری اور اس امن و امان کا قیام بیان کیا ہے جس کے بغیر دین کے احکام اور تقاضوں پر اطمینان سے عمل بھی نہیں ہو سکتا۔

مصنف کی نظر چونکہ مذاہب سابقہ پر بھی گہری اور وسیع ہے اور جدید فلسفے اور نظام بھی ان کی نظر سے پوشیدہ نہیں، عیسائیت کی تاریخ بھی ان کے سامنے ہے جو تفریق دین و سیاست کی قائل تھی اور اس کے متعلق ان کے نامور معاصر اور محبوب دوست اقبالؒ نے صحیح کہا ہے:

کلیسا کی بنیاد رہبانیت تھی
سماتی کہاں اس فقیری میں میری
خصوصیت تھی سلطانی و راہبی میں
کہ وہ سر بلندی ہے یہ سربزیری

اس لیئے خطبات مدارس اور رسول وحدت کے مصنف کے قلم سے بے اختیار اور کسی قدر جوش کے ساتھ یہ عبارت نکل گئی ہے کہ :

''اسلام دین و دنیا اور جنت ارضی اور جنت سماوی اور آسمانی بادشاہی اور زمین کی خلافت دونوں کی دعوت کو لے کر اول ہی روز سے پیدا ہوا' اس کے نزدیک عیسائیوں کی طرح خدا اور قیصر دو نہیں' ایک ہی شہنشاہ علی الاطلاق ہے' جس کے حدود حکومت میں نہ کوئی قیصر ہے اور نہ کوئی کسریٰ' اسی کا حکم عرش سے فرش تک اور آسمان سے زمین تک جاری ہے' وہی آسمان پر حکمران ہے وہی زمین پر فرمانروا ہے۔

وھو الذی فی السماء الہ وفی الارض الہ):(

اور وہی ہے جو آسمان میں اللہ اور وہی زمین میں بھی اللہ ہے (۲)۔

(۱)۔ مقدمہ ص ۴۷ (۲)۔ مقدمہ ص ۴۹

چونکہ ان کی مسلمانوں کی تاریخ پر وسیع اور گہری نظر ہے اور انہوں نے دیکھا کہ کس طرح خلافت اسلامی عام دنیاوی حکومت میں تبدیلی ہوگئی ہے' نیز موجودہ دور کے قیام حکومت کے نعرہ اور اس کے محرکات اور جذبات کو بھی سمجھتے ہیں' اس لیئے یہ لکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ :

اسلامی سلطنت کا مقصد نہ جزیہ کا حصول نہ خراج کا وصول ہے' نہ غنیمت کی فراوانی نہ دولت کی ارزانی' نہ تجارت کا فروغ' نہ جاہ و منصب کا فریب' نہ عیش و عشرت کا دھوکہ اور نہ شان و شوکت کا تماشہ ہے' بلکہ سرتاسر حقوق اللہ اور حقوق العباد کی بجا آوری اور اس کے لیئے جد و جہد اور سعی و محنت کی ذمہ داری کا نام ہے۔ (۱)۔

غرض یہ کتاب اپنے اختصار کے باوجود بہت سے فکر انگیز مضامین اور حقائق پر مشتمل ہے' اگر اس میں سیاسیات اور نظم حکومت کا پورا حصہ آجاتا تو وہ اس عظیم خلا کو بہترین

طریقے پر پر کرتی جو جدید اسلامی لٹریچر میں پایا جاتا ہے اور جس کی اہمیت کا احساس موجودہ حالات میں مغربی فلسفیوں کی سحر انگیزی اور اس کے تفوق و قیادت نے اور بڑھا دیا ہے' لیکن جو کچھ بھی ہے وہ اپنے اثر و وزن میں ''نقش سلیمانی'' ہے اور نقش ہمیشہ مختصر اور اکثر آنکھوں سے مستور رہتا ہے۔

آثار قیامت میں سے یہ بات بھی ہے کہ سیرت نگاری نبوی' متکلم اسلام اور نابغہ عصر' استاذ الاساتذہ علامہ سید سلیمان ندویؒ کی شہرۂ آفاق کتاب سیرۃ النبی ﷺ کی کسی جلد پر یہ ہیچ مدان پیش لفظ لکھے' لیکن کسی قدر اس سے تسکین ہوتی ہے کہ کتاب مکمل نہیں ہے' اس لیئے اس پر ایک ''ناقص'' کا کچھ لکھنا محل تعجب نہیں کہ

دیتے ہیں بادۂ ظرف قدح خوار دیکھ کر

دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔ ۲۸ مئی ۱۹۸۰ء

ابو الحسن علی ندوی (۲)۔ ۱۱ رجب ۱۴۰۰ھ

اظہار عجز

من و شبہا و بیداری و حیرانی و خاموشی!

کہ محرم نیست خسرو را زبان در گفت گوئے تو

دار المصنفین' اعظم گڑھ

ہیچ مدان مور سلیمان

۲۳ شعبان المعظم ۱۴۰۰ھ' ۷ جولائی ۱۹۸۰ء

سید صباح الدین عبد الرحمان

---

(۱)۔ مقدمہ ص (۲)۔ اس مضمون میں مقدمہ کے حوالہ میں جو صفحات نمبر دیے گئے ہیں وہ سابقہ ایڈیشن کے ہیں اس ایڈیشن میں نمبر صفحات تبدیل ہو گئے ہیں۔

# مقدمہ

الحمد اللہ رب العالمین و الصلوٰت و السلام علی
سید المرسلین و علی الہ و اصحابہ الطاہرین

## معاملات

### ساتویں جلد کا موضوع معاملات ::

سیرت کی یہ ساتویں جلد معاملات سے متعلق ہے۔

### معاملات کے حدود ::

معاملات کا اطلاق فقہائے حقوق عباد کے ایک خاص حصہ پر کیا ہے۔ مثلاً بعض فقہاء شافعیہ نے احکام شرعیہ کی تقسیم یوں کی ہے' یا تو وہ آخرت سے متعلق ہوں گے تو ان کا نام عبادات ہے اور یا امور دنیا سے اس کا تعلق ہوگا تو ان کی تین قسمیں ہیں' اگر ان احکام شرعیہ سے جو امور دین کے متعلق ہیں' اشخاص کی بقا مطلوب ہے تو ان کو معاملات کہتے ہیں (جیسے خرید و فروخت و اجارہ و رہن وغیرہ) اور اگر خاندان کی بقا مطلوب ہے تو ان کا نام مناکحات ہے (جیسے نکاح و طلاق و خلع و تفریق وغیرہ) اگر ان کی غرض کسی پوری آبادی (مدینہ) کی بقا ہے تو ان کو عقوبات کہیں (۱)۔ گے' (جیسے قصاص و سزا و تعزیرات وغیرہ)

امام شاطبی نے موافقات کے شروع میں دین کے ضروری احکام کی جن پر دین دنیا کی مصلحتیں موقوف ہیں اور جن کے نہ ہونے سے دین و دنیا میں فساد راہ پائے گا اور انسانی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی' یہ قسمیں کی ہیں۔

عبادات جیسے نماز روزہ وغیرہ' اور عادات جیسے ماکولات' مشروبات' ملبوسات اور مسکونات کے احکام' اور تیسری چیز معاملات ہے' جس سے مقصود نسل و نفس اور مال کی حفاظت ہے اور چوتھی چیز جنایات ہے' جس سے مقصود وہ احکام ہیں' جن کا اجرا اس

شخص پر ہوگا جو احکام بالا کو توڑے، جیسے قصاص وحدود وتعزیرات۔

فقہائے احناف میں سے علامہ ابن نجیمؒ نے بحرالراق کے شروع میں امور دین کو پانچ حصوں میں منقسم کیا ہے، اعتقادات، معاملات، مزاجر اور آداب اور ان میں سے معاملات کی تشریح یہ کی ہے کہ یہ حصہ پانچ بابوں پر منقسم ہے، معاوضات مالیہ (بیع و فروخت وغیرہ) مناکحات (نکاح وطلاق وغیرہ) مخاصمات (آپس کے جھگڑوں کا فیصلہ) امانات اور ترکات (وراثت) اور مزاجر، یعنی جن کاموں پر شریعت نے زجر کیا ہے اس کی بھی پانچ قسمیں ہیں، قتل نفس پر زجر، کسی کا مال زبردستی لے لینے پر زجر، کسی کی آبروریزی پر زجر، کسی کی پردہ دری پر زجر، قطع بیضہ (اسلام کا استیصال اور اس سے انحراف) پر زجر۔

(۱)۔ کشاف، اصطلاحات الفنون احمد تھانوی، مطبوعہ کلکتہ ج ۱ ص ۲۳ بحوالہ توضیح و تلویح۔

## معاملات سے ہماری مراد ::

لیکن ہم نے اس کتاب میں معاملات کا اطلاق ان تینوں تعبیروں سے زیادہ وسیع معنی میں کیا ہے، یعنی ہماری مراد معاملات سے وہ تمام احکام شرعیہ ہیں جن کا تعلق ان تمام حقوق عباد سے ہے جن کی حیثیت قانون کی ہے جن میں معاملات اور مزاجر دونوں داخل ہیں اور جن کا منشا جان و مال و آبرو کی حفاظت ہے، خواہ وہ اشخاص کی مصلحت سے متعلق ہوں یا خاندان کی یا پوری آبادی و مملکت (مدینہ) کی۔

آبادی و مملکت جن کا قانونی نام مدینہ ہے اس کی حفاظت و مصلحت کے قوانین کا نام سیاست ہے، لیکن ہمارے قدیم فقہاء نے اس کے لیئے سیر کی اصطلاح قائم کی ہے، جیسے کتاب السیر امام محمدؒ اس میں امارت وخلافت اور صلح و جنگ کے مسائل آجاتے ہیں اور متاخرین نے ان کو احکام سلطانیہ کے نام سے لکھا ہے، جیسے احکام السلطانیہ قاضی ماوردی شافعی المتوفی ۴۵۰ھ اور احکام السلطانیہ قاضی ابویعلی حنبلی المتوفی

۴۵۸ھ لیکن ان کتابوں میں ضمناً جزیہ وخراج وزکوٰۃ کی مناسبت سے مالی مسائل بھی زیر بحث آ گئے ہیں' اور اسی لیئے بعض بزرگوں نے ان مباحث کو الگ کر کے ان کا نام کتاب الاموال' یا کتاب الخراج رکھا ہے' جیسے کتاب الاموال ابوعبید بن سلام المتوفی ۲۲۴ھ اور کتاب الخراج قاضی ابو یوسف المتوفی ۱۸۲ھ اور کتاب الخراج یحیٰی بن آدم القرشی المتوفی ۲۰۳ھ' اہل سنت کے نزدیک گو امت اصول عقائد میں سے نہیں ہے تاہم اس کے ضروری مباحث کتب عقائد کے خاتمہ میں ذکر کر دیے جاتے ہیں جن میں امامت کے شرائط اور طریق انتخاب' اس کی ضرورت اور حقیقت پر مختصر بحثیں ہوتی ہیں۔

لیکن موجودہ زمانے میں ان مسائل کی ترتیب اور ان کے بیان کا طرز اگلے بزرگوں کے طرز بیان سے بالکل مختلف ہوگا اور ان کے لیئے اصطلاحیں بھی نئی اختیار کرنی پڑیں گی اس لیئے معاملات کی اس جلد میں قدیم اصطلاحات میں کمی بیشی اور مباحث میں ردوبدل اور نئی ضرورتوں کے لیئے نئے ابواب کا اضافہ ناگزیر ہے۔

اب ہماری نئی اصطلاح میں معاملات سے مقصود مسلمانوں کے وہ تمام انسانی کاروبار ہیں جن کا تعلق معاشرت مال و دولت اور حکومت کے ضابطوں اور قوانین سے ہے دوسرے لفظوں میں اس کی تعبیر یوں بھی کی جاسکتی ہے کہ اس کتاب میں معاملات کا اطلاق ان تمام اجتماعی کاروبار کے ضابطوں اور قانون پر ہوا ہے جن سے دو یا دو سے زائد افراد یا پوری جماعت کے قانون حقوق کی تشریح ہو اور ان کے ضابطوں اور قانون کی تفصیل ہو ان تمام مسائل کو اگر ہم کسی قدر مسامحت کے ساتھ چند بڑے بڑے عنوانوں کے تحت کرنا چاہیں تو حسب ذیل تین قسمیں ہوسکتی ہیں' معاشریات' اقتصادیات اور سیاسیات اور ان تینوں کے تحت میں اور بہت سے ضمنی ابواب ہوسکتے ہیں' اور انہی تینوں مباحث کے مجموعہ پر معاملات کا اطلاق کیا گیا ہے' معاشرت میں نکاح وطلاق وغیرہ کے قوانین سے بحث ہوگی' اقتصادیات میں تمام

مالی وتجارتی کاروبار کا بیان آ جائے گا اور سیاسیات میں حکومت وسلطنت اور اس کے متعلقات مذکور ہوں گے۔

## اس کام کا اشکال ::

یہ احکام قرآن پاک کی مختلف سورتوں میں مذکور ہیں، محدثین نے حدیث کی کتابوں میں ان حدیثوں کا مختلف ابواب میں ذکر فرمایا ہے جن میں یہ احکام مذکور ہیں اور فقہاء نے فقہ کے متعدد بابوں میں ان مسائل کا احاطہ کیا ہے اس لیئے ان احکام کو اگر صرف نقل ہی کر دینا ہوتا تو کام آسان تھا مگر موجودہ زمانے میں کام کی نوعیت اتنی ہی نہیں ہے بلکہ اول تو ضرورت یہ ہے کہ ان مسائل کی تشریح ایسے رنگ میں کی جائے جس سے مذاق حال تسکین پا سکے اور ان کے علاوہ جو مسائل آج ہمارے سامنے نئے ہیں ان کا حل بھی ان کے سابق نظائر کو سامنے رکھ کر سوچا جائے، ان امور کی تشریح میں ہزار احتیاطوں کے باوجود قلم کے مسافر کو ایسی راہوں سے گزرنا ہوگا جن میں ہر قدم پر لغزش کا خطرہ ہے اور خصوصًا اس لیئے کہ سیاسیات و اقتصادیات کے موجودہ توقع سوالوں کے جوابات اور ان کے متعلقہ اصولی نظریات سے قدماء کی کتابیں نصا" اکثر خالی ہیں اور ان کی روشنی کے بغیر راہ کو سلامت سے طے کر لے جانا بہت ہی مشکل نظر آتا ہے، مشکلات کا ایک اور سبب یہ ہے کہ عہد نبوی ﷺ کے سیاسیات کے احکام وفرائض کا ماخذ خود ذات نبوی علی صاحبہا الصلوٰۃ ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات مبارک میں امامت کے ساتھ نبوت بھی جمع ہے جس سے ایک دوسرے سے جدا کرنا ناخن کو گوشت سے علیحدہ کرنا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اس جلد کے لکھنے میں اس ہیچ مداں کو سالہا سال ہچکچاہٹ محسوس ہوتی رہی اور بار ہا قدم کو آگے بڑھا بڑھا کر پیچھے ہٹا لینا پڑا، چنانچہ کام کا آغاز گوے جمادی الثانیہ ۱۳۵۸ھ کو کر دیا گیا تھا لیکن کچھ صفحے لکھ کر چھوڑ دیے، دو سال کے بعد ۲۹ رمضان ۱۳۶۰ھ کو پھر لکھنے کا تہیہ کر لیا اور پھر رک جانا پڑا، ۲۴ شعبان ۱۳۶۲ھ کو پھر

## قانون سازوں کی بیچارگی ::

اگر اسلام کے قانون میں مسلم اور غیر مسلم کا ایک فرق بیچ میں حائل ہے تو جمہوری نظام میں ملکی اور غیر ملکی قوم اور غیر قوم' امیر اور غریب' سرمایہ دار اور مزدور' تجارت پیشہ اور زمیندار' طبقہ اور غیر طبقہ' پارٹی اور غیر پارٹی کے بیسیوں حجابات اور دیواریں حائل ہیں جن میں سے ہر ایک اس قدر مضبوط ہے کہ اس کا ہٹانا آسان نہیں' جب کوئی تجویز معرض بحث میں آتی ہے تو انسانیت کے نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ **ملک**' قوم' جماعت' طبقہ اور پارٹی کے نقطۂ نگاہ سے اس کا فیصلہ کیا جاتا ہے اور اس کو جمہور کے لیئے آیئہ رحمت ثابت کیا جاتا ہے۔

## جمہوریت کی ناکامی ::

اس جوش وخروش اور قوت اور دلیل سے جو تجویز آیئہ رحمت بن کر منظور ہوتی ہے اس کی کمزوری کا یہ عالم ہے کہ ہر دوسری مجلس میں وہ بیک دفعہ یا چند منزلوں کے بعد بدل جاتی ہے پھر ایک نئی تجویز اس کی جگہ پر آتی ہے اس کی عمر بھی چند روز سے زیادہ وفا نہیں کرتی' آخر وہ بھی فنا ہو جاتی ہے اور تیسری اور چوتھی اور پانچویں آتی ہے اور اپنی اپنی راہ سے فنا کے گھاٹ اتر جاتی ہے' ان تمام تغیرات کی تہ میں جو ہاتھ کام کرتا ہے وہ قومی و جماعتی اور شخصی مفاد کا اول بدل اور تغیر ہے' ایک راہ سے جب کسی جماعت کو فائدہ نہیں پہنچتا ہے یا ایک کو پہنچتا ہے دوسرے کو نہیں' تو وہ دوسری راہ سے اس کو ڈھونڈتی ہے اور جب وہ راہ بھی بند پاتی ہے تو تیسری راہ کی تلاش ہوتی ہے اور یوں ہی پوری عمر آوارہ گردی اور تلاش میں گزر جاتی ہے اور جمہور کو طمانیت کی دولت ہاتھ نہیں آتی۔

## صحیح وعادلانہ قانون سازی سے انسانیت کی ناچاری ::

ان تغیرات کے باوجود قانون بنتا ہے' چونکہ وہ صرف ظاہر طاقت پر مبنی ہوتا ہے اس

لئے اس کے چلانے میں اس کے چلانے والوں کا دل شریک نہیں ہوا' اس لیئے قدم قدم پر اس کے چلانے والوں کے ذاتی مفاد سے ٹکراتا ہے اور بارہا وہ حرص وطمع' غرور وتکبر' ہوا وہوس' رشوت اور انتفاع ناجائز وخوف وہراس اور مکر وحیلہ کے بیسیوں خلاف انسانیت جذبات سے ٹکرا کر چور چور ہو جاتا ہے اور عدل وانصاف کی میزان ہاتھ سے ٹوٹ جاتی ہے۔

## قانون الٰہی کی ضرورت ::

اسی سبب سے مصلحت الٰہی کا تقاضا یہ تھا کہ عدل وانصاف کی یہ میزان خود دست الٰہی میں ہو' وہ جو کسی فرقہ اور کسی پارٹی میں نہیں' کسی کا ایسا نہیں جو دوسرے کا نہیں' وہ سب کا ہے اور سب کے لیئے ہے اور تمام نفسانی اغراض سے پاک و بے نیاز ہے جس کو اپنے لیئے اور اپنی غرض کے لیئے کچھ نہیں چاہئے جس کو دنیا اور اس کی فطرت کا ایک ایک راز معلوم ہے اور جو کائنات کے ذرہ ذرہ سے آگاہ اور گوشہ گوشہ سے باخبر ہے' ٹھیک اسی طرح جس طرح دنیا میں عرش سے فرش تک اس نے اپنا تکوینی فرمان جس کو قانون طبعی کہتے ہیں' جاری کر رکھا ہے اسی طرح زمین پر اپنا تشریعی فرمان جس کو شریعت کہتے ہیں جاری فرمائے جو تمام تر عدل وانصاف پر مبنی ہے:

الله الذی انزل الکتاب بالحق و المیزان (شوریٰ:۳)

وہ اللہ جس نے حق اور ترازو کے ساتھ اپنی کتاب (قانون) اتاری۔

وانزل معهم الکتاب و المیزان (حدید:۳)

اور نبیوں کے ساتھ کتاب (قانون) اور ترازو اتاری۔

## کتاب اور میزان ::

میزان سے مقصود یہ کانٹا اور لوہے کی ترازو نہیں' بلکہ فطرت اور عدل وانصاف اور حق کی میزان ہے جس سے سارا نظام کائنات تل رہا ہے' اور انسانی کاروبار اور اعمال

تولے جاتے ہیں چنانچہ تمام معاملات میں انصاف کا خلاصہ اگر ایک لفظ میں کیا جائے تو یہ ہے کہ عدل کی میزان میں اونچ نیچ نہ آئے۔

الرحمان. علم القرآن. خلق الانسان . علمه البيان .
الشمس و القمر بحسبان . و النجم و الشجر يسجدان .
و السماء رفعها و وضع الميزان. الا تطغوا في
الميزان. واقيموا الوزن بالقسط ولا تخسروا الميزان .
(رحمٰن: ۱)

رحمت والا خدا جس نے قرآن سکھایا' انسان کو بنایا اور اس کو گویائی سکھائی' سورج اور چاند حساب کے ساتھ ہیں اور بے تنے کے درخت اور تنے دار درخت اس کے زیر فرمان ہیں اور اسی نے آسمان کو اونچا کیا اور اسی نے ترازو (میزان) رکھ دی تا کہ تول میں کمی بیشی نہ کرو اور تول کو انصاف کے ساتھ قائم رکھو اور تول کو گھٹاؤ نہیں۔

یہ دنیا کی سب سے بڑی ترازو ہے اسی سے دنیا میں اعمال اور معاملات تولے جاتے ہیں' اسی کے اعتدال اور اونچ نیچ کا نام حق اور باطل' انصاف اور ظلم' صحیح اور غلط ہے اس لیئے اس پیمانہ اور ترازو کو ہمیشہ سچائی اور انصاف کے کانٹے پر رکھو۔ ان آیتوں میں انسان کا آفتاب' ماہتاب اور نباتات سے پہلے تذکرہ ہے کہ یہ قصد واردہ سے محروم مخلوقات اللہ تعالیٰ کے تکوینی فرمان کے تحت طبعی طور سے قصد واردہ کے بغیر کس طرح عدل و انصاف اور اللہ تعالیٰ کے مقررہ طبعی اور احکام و اصول کے مطابق چل رہی ہیں' اسی طرح قصد واردہ کی دولت و نعمت سے سرفراز مخلوق انسان کو بھی چاہئے کہ وہ ہوائے نفسانی سے بچ کر اپنے قصد واردہ سے اللہ تعالیٰ کے احکام عدل کی پیروی اختیار کرے' قرآن پاک میں بار بار ہے:

و اوفوا الكيل و الميزان (انعام:۱۵۲)

اور ناپ اور تول کو پورا کرتے رہو۔

فاوفوا الیکل و المیزان (اعراف: ۹)

تو ناپ اور تول کو پورا رکھو۔

اوفو المکیال و المیزان (ہود: ۹)

ناپ اور تول کو پورا کرو۔

ولا تنقصوا المکیال والمیزان (ہود: ۹)

ناپ اور تول کو گھٹاؤ نہیں۔

ان آیتوں میں ناپ اور تول سے معمولی لین دین اور خرید وفروخت کی اشیاء بھی مراد لی جاسکتی ہیں اور لی گئی ہیں' لیکن اس پیمانے کو وسیع کیجئے تو سارے انسانی معاملات اس ترازو اور پیمانہ میں سما جاتے ہیں' (۱)۔ ہر انسانی ظلم کا تخم یہ ہے کہ انسان اپنے لیئے ایک پیمانہ اور دوسرے کی دوسرا پیمانہ چاہتا ہے' وہ اپنے لیئے ایک ترازو سے ناپتا ہے اور دوسروں کے لیئے دوسری ترازو سے' اس ستم پیشہ پر خدا کی اور ساری دنیا کی پھٹکار

---

(۱)۔ تفسیر طبری میں آیات میزان سورئہ حدید اور سورئہ رحمان وغیرہ میں دیکھئے۔

ویل للمطففین الذین اذا اکتالوا علی الناس یستوفون واذا کالوھم او وزنوھم یخسرون (تطفیف: ۱)

پھٹکار ہے ان کم کردینے والوں پر جو اپنے لیئے لوگوں سے ناپ پوری لیتے ہیں' اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو کم کردیتے ہیں۔

معاملات انسانی میں فساد کی پوری فہرست اسی ایک اجمال کی تفصیل اور اسی نکتہ کی تشریح ہے' چنانچہ سورۂ حدید میں زمین پر قیام عدل کے تین ذریعے ظاہر فرمائے گئے ہیں۔

لقد ارسلنا رسلنا بالبینت و انزلنا معھم الکتاب والیزان لیقوم الناس بالقسط و انزلنا الحدید فیہ باس

پلک اور لمحے دم بدم بدل رہے ہیں سال پر سال آتے ہیں مگر چاند اور سورج وہی ہیں ‘ان کی چال اور گردش وہی ہے اور ان کے قاعدے اور قانون وہی ہیں‘ جو طبعی قانون آج سے ہزار برس پہلے آب وگل کی دنیا پر حکمران تھا‘ آج بھی وہی ہے اس میں نہ پہلی صدی تغیر پیدا کر سکی‘ نہ چودھویں‘ پہلے بھی سال کے بارہ شمسی یا قمری دورے تھے اور اب بھی ہیں کل بھی دن رات کے چوبیس گھنٹے تھے اور اب بھی ہیں۔

یعنی خدا کی بات جہاں تھی وہیں رہی۔

ولن تجد لسنته الله تبديلا (فتح:۳)

خدا کے قانون میں تو کوئی ادل بدل نہ پائے گا۔

## فطری حقوق ومعاملات کی یکسانی ::

ٹھیک اسی اصول پر جو اخلاقی و معاشرتی قوانین اور انسانی معاملات کے جو اصول فطری ہیں ان میں نہ کبھی کوئی تغیر نہ ہوا ہے نہ ہوگا‘ نیکی بدی نہیں بنتی‘ بدی نیکی نہیں‘ سچ جھوٹ نہیں ہو جاتا‘ جھوٹ سچ نہیں‘ ظلم انصاف کا نام نہیں پاتا اور انصاف ظلم کا نہیں‘ دوسروں کے حقوق کو غصب کرنا‘ دوسروں کی چیز ناحق لینا‘ چوری کرنا‘ ڈاکہ ڈالنا‘ دوسروں کی عزت و آبرو کو داغ لگانا‘ دوسروں کے مال کو ناجائز طریق سے لے لینا۔ حق قانون کے بغیر کسی عورت پر تصرف کرنا‘ کسی کی جائیداد اور ملکیت پر قبضہ کرنا ہمیشہ ناجائز رہا ہے اور رہے گا۔ لین دین میں طرفین کی رضامندی‘ لڑائی اور جھگڑے کے اسباب کی روک تھام‘ اخلاق سوز حرکات کی بندش‘ فتنہ وفساد کا انسداد‘ ظالمانہ طریقوں کی ممانعت‘ ہر عہد میں‘ ہر قانون کی متفقہ دفعہ رہی ہے جب کبھی کوئی قانون بنا ہے یہی فطری دفعات قانون کی ضروری اجزا رہے ہیں اور اب بھی جب کبھی بنے گا اس کے یہ اجزا برقرار رہیں گے‘ البتہ اس کے جزئیات نئے نئے پیش آئیں گے اور نئی نئی شکلوں میں ان کلیات کے فروع سامنے آتے رہیں گے اور ان کے لیئے قانون الٰہی کے کلیات سے جزئیات اور احکام سے نظائر ہمیشہ نکلتے اور بنتے

رہیں گے۔

## قانون کا بنیادی تخیل ::

ہر مجموعہ قانون کا ایک بنیادی تخیل ہوتا ہے جس پر اس مجموعہ کے ایک ایک جز کی بنیاد ہوتی ہے' یہ بنیاد کہیں قومی فوقیت' کہیں وطنی افادیت' کہیں نسلی امتیاز اور کہیں تجارتی مفاد قرار پاتی ہے اس لیئے اس مجموعہ قانون میں اسی بنیادی نقطۂ غرض کی لکیریں ابھری نظر آتی ہیں جہاں قانون کی بنیادی قومی فوقیت ہے' وہاں کالے گورے' یورپین اور نیٹو کے اصول پر کارفرمائی ہے جہاں وطن قانون کی اساس ہے وہاں جغرافی اقطاع ارضی قانون کے اختلافات کا باعث ہوتے ہیں اور رومی اور غیر رومی' یونانی اور غیر یونانی' مصری اور غیر مصری' ملکی اور غیر ملکی نزاعات نے انسانی مفاد کے ٹکڑے کر دیے ہیں یہی جذبہ آگے بڑھ کر ملک میں بھی صوبہ اور اختلاف کا بیج بوتا ہے' ہندوستانی ہونے کے باوجود پنجابی بنگال میں بنگالی پنجاب میں بیگانہ ہے' بہاری یوپی میں جگہ نہیں پا سکتا اور یوپی والے پر بہار کی وسعت تنگ ہے' فیشزم اور نازی ازم میں نسل کے دیوتا کی پوجا ہوتی ہے اور موجودہ امپیریلزم میں تجارتی مفاد کی خاطر قومیں غلام بنائی جاتی ہیں۔

## قانون الٰہی کی بنیاد اور اس کی عمومیت ::

اسلام کے قانون کی بنیاد اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی اور اطاعت کے لیئے زمین سے فتنہ و فساد کا دفع' اس کے بندوں کے درمیان عدل و انصاف اور امن و اطمینان کا قیام اور معاملات میں لوگوں کے درمیان سے نزاع اور خدع و فریب کی روک تھام ہے' (۱)۔ چنانچہ اسلام کے قانون میں جتنے حدود و تعزیرات ہیں ان کا مقصد زمین سے فتنہ و فساد کا دفع ہے اور جس قدر معاملات و معاشرت کے اصول اور مسائل ہیں' ان کا منشا بندوں کے درمیان عدل و انصاف اور امن و اطمینان کا قیام ہے' اور معاملات میں جتنے قانونی ممنوعات اور منہیات ہیں' ان سب کا منشا باہمی نزاع اور

خدع وفریب کا استیصال ہے۔

(۱)۔ علامہ عزالدین بن عبدالسلام مصری المتوفی ۶۶۰ھ کی کتاب قواعدالحکام فی مصالح الانام' اور شاہ ولی اللہ صاحب دھلوی کی کتاب حجتہ اللہ البالغہ کے ابواب معاملات ملاحظہ ہوں۔

اس اوپر کی تفصیل میں آپ نے دیکھا کہ کہیں رنگ اور نسل کا کوئی اختلاف' زبان اور لغت اور تہذیب وتمدن کا کوئی فرق اور ملک واقلیم کا کوئی امتیاز زیر بحث نہیں آیا ہے' یہ قانون خدا کا ہے' خدا کے سارے بندوں کے لیئے بنایا گیا ہے' وہ چاہے کالے ہوں یا گورے' آریائی ہوں یا سامی' یورپی ہوں یا ایشیائی' ہندی ہوں یا حجازی' عجمی ہوں یا تاتاری' سب کے لیئے یکساں اور سب کے لیئے برابر ہیں۔

## ایک اصولی فرق ::

بے شبہ ایک فرق اس میں جائز رکھا گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ حکومت ان کی ہوگی جو اس کے اس قانون کو قانون الٰہی تسلیم کرتے ہیں' اس بنا پر انسانی افراد کی چار قسمیں ہو جاتی ہیں ایک وہ جو اس قانون کو قانون الٰہی تسلیم کرتے ہیں' یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے خدائے واحد برحق کی طرف سے آخری طور پر آیا ہوا قانون مانتے ہیں' مسلمان ہیں' دوسرے وہ جو گو اس خاص قانون الٰہی کو نہیں مانتے لیکن وہ کسی نہ کسی اگلے قانون الٰہی کو خواہ وہ کیسے ہی غیر محفوظ صورت میں اس وقت ہو' مانتے ہیں' ان کا نام ذمی ہے' لیکن ان کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جن کے پاس مانا ہوا قانون الٰہی اب بھی ان کے مانے ہوئے صحیفہ الٰہی کے ضمن میں موجود ہے' یہ کتابی اور دوئم وہ جو اپنے قانون الٰہی کے صحیفہ کو کھو بیٹھے ہیں' یہ شبہ کتابی ہیں۔ چوتھی وہ ہیں جو سرے سے ہر صحیفہ الٰہی سے ناآشنا اور ہر قانون الٰہی سے محروم ہیں ان کو مشرک کہتے ہیں' اسلامی قانون الٰہی میں ان چاروں کے درمیان بے شبہ بعض امتیازات ہیں' جن کی تفصیل اور مصلحتیں اپنی جگہ پر آئیں گی۔

اس تفصیل کے بعد آپ کو اجمالاً یہ اندازہ ہوگیا ہے کہ معاملات کے حدود کیا ہیں اور

اس کی وسعت میں کیا کیا چیزیں داخل ہیں' تاہم اس اجمال کا ایک ہلکا سا خاکہ آپ کے سامنے ہم بھی کھینچ دیتے ہیں۔

باہم انسانوں کے درمیان خوشگوار تعلقات کے برقرار اور امور معاشرت کی میزان کو درست رکھنے کے لیئے ایک عاملانہ طاقت وقوت کا وجود ضروری ہے' جو ہر چیز کو احکام شرع اور نظام عدل کے مطابق قائم رکھے' اس بحث کے دو ضروری جز ہیں۔

۱۔ اس عاملانہ طاقت وقوت کی ضرورت' حقیقت' اس کے شرائط و اوصاف اور اس کے شعبے اور ادارے۔

۲۔ معاملات انسانی کے اقسام اور ہر قسم کے علیحدہ علیحدہ احکام' اور اس کے اسرار و مصالح۔

## اسلام میں حکومت کی حیثیت واہمیت ::

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دنیا میں دین اور دنیا دونوں کی برکتیں لے کر آئے' آپ ﷺ نے صرف آسمانی بادشاہی کی خوشخبری نہیں سنائی' بلکہ آسمانی بادشاہی کے ساتھ دنیا کی بادشاہی کی بھی بشارت دی' تاکہ دنیا میں خدا کی بندگی اور رضا جوئی بے خوف وخطر کی جا سکے اور اس کے لیئے خدا کی بادشاہی خدا کے قانون کے مطابق دنیا میں قائم ہو۔

وعد الله الذين آمنوا منكم وعملوا الصلحت ليستخلفنهم في الارض كما استخلف الذين من قبلهم وليمكنن لهم دينهم الذى ارتضى لهم وليبد لنهم من بعد خوفهم امنا. يعبدوننى لا يشركون بى شيا. (نور:۷)

خدا نے ان سے جو ایمان لائے اور اچھے عمل کیئے' یہ وعدہ کیا کہ وہ ان کو زمین میں حاکم بنائے گا' جیسا کہ ان کو حاکم بنایا تھا جو ان سے پہلے تھے اور ان کے لیئے ان کے اس دین کو

جس کو اس نے ان کے واسطے پسند کیا ہے، جما دے گا اور ان کو
ان کی اس بے امنی کے بدلے امن دے گا، میری بندگی
کریں گے، میرا کسی کو ساجھی نہ بنائیں گے۔

اور اس کے لیئے خدا کے نافرمانوں سے لڑائی لڑی جائے تا کہ سارا حکم اسی ایک خدا کا ہو جائے:

وقاتلوھم حتی لا تکون فتنۃ ویکون الدین کلہ للہ (انفال:۵)

اور ان سے لڑتے رہو۔ یہاں تک کہ فساد نہ رہے، اور سب حکم
اللہ کا ہو جائے۔

قرآن نے خدا کے بعض نیک بندوں کی دعا یہ بتائی ہے:

ربنا اتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الاخرہ حسنۃ وقنا عذاب النار (بقرہ:۲۵)

اے ہمارے پروردگار! ہم کو دنیا میں بھلائی دے، اور آخرت
میں بھلائی دے، اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا۔

آخرت کی بھلائی تو معلوم ہے، لیکن دنیا کی بھلائی ہمارے مفسروں نے یہ بتائی ہے، علم و عبادت، تندرستی روزی، مال و دولت، فتح و نصرت، اولاد صالح، مگر یہ بھی حق تعالیٰ کے اطلاق کی تحدید ہے۔ دنیا کی بھلائی وہ ہے جو خدا کی شریعت میں جائز ہے، ایک اور جگہ فرمایا:

للذین احسنو فی ھذہ الدنیا حسنۃ. ولدار الاخرہ خیر. ولنعم دار لمتقین۔ (نحل:۴)

اور جنہوں نے نیک کام کیے ان کے لیئے دنیا میں بھلائی ہے
اور آخرت کا گھر سب سے اچھا ہے اور پرہیزگاروں کا گھر
کیسا اچھا ہے۔

مقصود یہ ہے کہ نیکوکاروں کے لیے دنیا کی بھلائی اور عزت بھی ہے، اور آخرت کی

بھی، لیکن آخرت کی بھلائی دنیا کی بھلائی سے زیادہ بہتر اور زیادہ خوب ہے۔

جن لوگوں نے خدا کی راہ میں اپنی جانوں کی بازی لگائی ان کو بشارت ہے:۔

فاتھم اللہ ثواب الدنیا و حسن ثواب الاخرہت واللہ یحب المحسنین۔ (آل عمران:۱۵)

تو اللہ نے ان کو دنیا کا ثواب اور آخرت کا بھلا ثواب عنایت کیا اور اللہ نیکی والوں کو چاہتا ہے۔

دنیا کا ثواب فتح و نصرت، ناموری و عزت، مال و دولت اور حکومت و سلطنت ہے۔

جنہوں نے خدا کی راہ میں اپنا گھر بار چھوڑا اور خوشی خوشی ہر طرح کی تکلیف جھیلی، خدا نے ان کو دونوں جہان کی نعمتیں بخشیں۔

والذین ھاجرو فی اللہ من بعد ما ظلمو لنبوئنھم فی الدنیا حسنہت ولاجرالاخرہت اکبر (نحل:۶)

اور جنہوں نے گھر چھوڑا خدا کے لیے ستائے جانے کے بعد ہم ان کو دنیا میں اچھا ٹھکانہ دیں گے اور بے شک آخرت کی مزدوری سب سے بڑی ہے۔

دنیا کا اچھا ٹھکانا دنیا کی ہر جائز نعمت اور سطوت و حکومت ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دین اور دنیا دونوں کی نعمتوں کی دعا مانگی۔

واکتب لنا فی ھذہ الدنیا حسنہت و فی الاخرہت (اعراف:۱۹)

اور (اے خدا) ہمارے لیے اس دنیا میں بھلائی لکھ اور آخرت میں بھی۔

ان سب آیتوں میں یہ بات خیال کے قابل ہے کہ ایمان اور نیکی والوں کو دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی کی امید دلائی گئی ہے، مگر ہر جگہ یہ بتا دیا گیا ہے کہ دنیا کی ہر بھلائی سے آخرت کی بھلائی اونچی، اچھی اور پائیدار ہے اس لیے دنیا کی بھلائی ہماری زندگی کا اصل مقصد نہیں، بلکہ ضمنی ہو، یعنی آخرت کے کاموں کے صدقہ میں ہو

ورنہ اگر دنیا ہی کو اپنی زندگی کا مقصد بنالیا تو دنیا مل جائے گی مگر آخرت ہاتھ نہ آئے گی۔

من کان یرید الحیوہت الدنیا و زینتها نوف الیهم اعمالهم و هم فیها لا یبخسون اولئك الذین لیس لهم فی الاخرہت الا النار و حبط ما صنعوا فیها و بطل ما کانوا یعملون (ہود:۲)

جو کوئی دنیاوی زندگی اور اس کی آرائش چاہے تو ہم ان کے عمل ان کو اسی دنیا میں بھر کر دیتے ہیں' اور کمی نہیں کی جاتی یہ وہ ہیں جن کے لیے آخرت میں دوزخ کے سوا کچھ نہیں' اور وہاں جو کیا تھا مٹ گیا' اور ان کی کمائی اکارت ہوئی۔

من کان یرید حرث الاخرہت و نزدله فی حرثه و من کان یرید حرث الدنیا نوته منها و ما له فی الاخرہت من نصیب (شوریٰ:۳)

جو کوئی آخرت کی کھیتی چاہتا ہے تو ہم اس کی کھیتی بڑھاتے ہیں اور جو دنیا کی کھیتی چاہتا ہو تو ہم دنیا میں سے اس کو کچھ دیتے ہیں اور آخرت میں اس کا کچھ حصہ نہیں۔

من یرد ثواب الدنیا نوته منها و من یرد ثواب الاخرہت نوته منها و سنجزی الشاکرین۔ (آل عمران:۱۵)

جو دنیا کا ثواب چاہے گا تو اس میں سے ہم اس کو دیں گے اور جو آخرت کا ثواب چاہے گا اس میں سے ہم اس کو دیں گے اور شکر گزاروں کو ہم پورا اجر دیں گے۔

من کان یرید العاجلہت عجلنا له فیها مانشاء لمن نرید ثم جعلنا له جهنم یصلها مذموما مدحورا و من اراد الاخرہت و سعی لها سعیها وهو مومن فاولئك کان سعیهم مشکورا (بنی اسرائیل:۲)

جوکوئی چاہتا ہو دنیائے عاجل کو تو ہم جلد دے دیتے ہیں جس کو جو چاہتے ہیں پھر ہم نے اس کے لیے دوزخ کو بنایا ہے وہ اس میں داخل ہوگا برا ہو کر' دھکیلا جا کر' اور جوکوئی آخرت چاہے اور اس کی پوری کوشش کرے اور وہ ایمان والا ہو تو وہی ہیں جن کی کوششوں کی قدر کی جائے گی۔

من کان یرید ثواب الدنیا فعند اللہ ثواب الدنیا والاخرہت (نساء: ۱۹)

تو جوکوئی دنیا کا ثواب چاہتا ہے تو (اس کو معلوم ہو) کہ اللہ کے پاس دنیا و آخرت دونوں کا ثواب ہے۔

پھر وہ کتنا احمق ہے جو صرف دنیا کے ثواب کا طالب ہے' حالانکہ خدا کے پاس تو دونوں جہان کے خزانے ہیں۔

غرض یہ ہے کہ جو تنہا دنیا کا طالب ہے وہ آخرت سے محروم ہے لیکن جو آخرت کا طلب گار ہے اس کے لیے دونوں گھروں کے دروازے کھلے ہیں' لیکن جو اپنی حماقت اور نادانی سے صرف دنیا کے ثواب کا طالب بنے گا تو دنیا تو اس کو مل جائے گی مگر آخرت کے ثواب کا دروازہ اس کے لیے بند ہو جائے گا۔

اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت حکومت اور سلطنت اور دنیا کی سیاست ہے یہاں تک کہ کتاب اور نبوت کی دولت کے بعد اسی کا درجہ ہے۔

فقد اتینا ال ابراھیم الکتاب والحکمہت و اتیناھم ملکا عظیما (نساء: ۸)

تو ہم نے ابراہیم والوں کو کتاب اور حکمت دی' اور بڑی سلطنت بخشی۔

حضرت موسیٰؑ اپنی قوم سے کہتے ہیں:

یقوم اذکرو انعمتہ اللہ علیکم اذ جعل فیکم انبیاء وجعلکم ملوکا۔ (مائدہ: ۴)

اے میرے لوگو! اپنے اوپر اللہ کے احسان کو یاد کرو جب تم
میں نبی بنائے اور تم کو بادشاہ بنایا۔

حضرت موسیٰ کی یہ پیشین گوئی جو خبر کی صورت میں، حضرت طالوت بادشاہ اور حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں پوری ہوئی، طالوت کی نسبت خبر دی گئی۔

ان اللہ قد بعث لکم طالوت ملکا (بقرہ: ۲ ۳)

بے شبہ خدا نے طالوت کو تمہارا بادشاہ مقرر کیا۔

لوگ اس پر معترض ہوئے تو فرمایا:

واللہ یوتی ملکہ من یشاء (بقرہ: ۲ ۳)

اور اللہ جس کو چاہے اپنی حکومت دے دے۔

حضرت داؤد علیہ السلام کو خطاب ہوا:

یا دائود انا جعلنک خلیفۃ فی الارض (ص: ۲)

اے داؤد! ہم نے تم کو زمین میں بادشاہ بنایا ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس نعمت میں مزید وسعت کی دعا فرمائی:

رب اغفرلی وھب لی ملکا لا ینبغی لاحد من
بعدی (ص: ۲)

اے میرے پروردگار! میری مغفرت کر اور مجھ کو ایسی
بادشاہی عطا فرما کہ میرے بعد کسی کو شایاں نہ ہو۔

یہ نعمت کسی انسان کے دینے لینے سے نہیں ملتی، اس کا مالک اللہ تعالیٰ ہے وہ جس کو چاہے دے اور جس سے چاہے چھین لے۔

اللھم ملک الملک توتی الملک من تشاء و تنزع
الملک ممن تشاء (آل عمران: ۳)

اے اللہ! اے سلطنت کے مالک تو جسے چاہے سلطنت بخشے
اور جس سے چاہے سلطنت چھین لے۔

وہ دیتا کس کو اور چھینتا کس سے ہے؟ اس کے متعلق اپنا قاعدہ کلیہ بنایا ہے:

ان الارض یرثھا عبادی الصلحون ان فی ھذا البلاغا لقوم عبدین (الانبیاء:۷)

بے شک زمین کے مالک میری صالح بندے ہوتے ہیں۔

اس اعلان میں خدا کے فرمانبردار لوگوں کیلئے پیغام ہے

نعمت ملنے کی بشارت ملی تھی تو ساتھ ہی یہ بتا دیا گیا کہ یہ نعمت ان کے کن کاموں کا معاوضہ ہے فرمایا:

و لینصرن اللہ من ینصرہ ط ان اللہ لقوی عزیز. الذین ان مکنھم فی الارض اقاموا الصلوہ واتوا الزکوہ وامر بالمعروف ونھوا عن المنکر ط ولله عاقبہ الامور۔ (حج:۲)

اور البتہ خدا اسی کی مدد کرے گا جو اس کی مدد کرتا ہے بے شک اللہ زبردست قوت والا ہے وہ کہ اگر ہم کو زمین میں جما دیں تو وہ نماز کھڑی کریں، زکوٰۃ دیں، اچھے کاموں کو کہیں اور برے کاموں سے روکیں اور ہر کام کا انجام خدا کے اختیار میں ہے۔

اور ظاہر ہے کہ جو اچھے کاموں کو کہے گا اور برے کاموں سے روکے گا، وہ پہلے خود اچھا ہوگا، اور برے کاموں سے باز رہتا ہوگا۔

خدا کی مدد کرنے کے معنی یہ ہیں کہ خدا کے دین حق کی مدد کی جائے، جو لوگ حق کی مدد کے لیئے اٹھتے ہیں، خدا ان کی مدد فرماتا ہے، ان آیتوں سے یہ اشارہ بھی نکلا کہ مسلمانوں کے ہاتھوں میں خدا کے قانون کے اجرا کی طاقت ہونی چاہئے، چنانچہ اسلام میں سارے حدود تعزیرات اسی منشا کے مطابق ہیں۔

زنا کی حد میں فرمایا:

ولا تاخذ کم بھما رافہ فی دین اللہ ان کنتم تو

منون باللہ والیوم الاخر۔ (نور: ۱)

اور تم کو ان دونوں (زانیوں) پر اللہ کی حد جاری کرنے میں کوئی ترس نہ آوے اگر تم اللہ اور پچھلے دن پر یقین رکھتے ہو۔

سود کے اسلامی قانون کو جو نہ مانے اسے اللہ اور رسول سے لڑائی کیلئے تیار ہونا چاہئے۔

فاذنوا بحرب من اللہ ورسولہ (بقرہ: ۳۸)

تو اے سود کھانے والو! اللہ اور اس کے رسول سے لڑنے کیلئے خبردار ہو جاؤ۔

اس لیئے نجران کے عیسائیوں سے آپ نے صلح کا جو معاہدہ کیا تھا اس کی ایک دفعہ یہ تھی کہ اگر وہ سودی لین دین کریں گے تو یہ معاہدہ ختم ہو جائے گا۔ (۱)۔ جو لوگ اسلام کے ملک میں بغاوت کریں، ڈاکہ ڈالیں، لوٹ مار کریں، قرآن اس کو خدا اور رسول سے لڑنا کہتا ہے اور اس کی سزا قتل، پھانسی، قطع ید اور قید یا جلاوطنی ہے اور ان کی اس بے کسی و بے بسی کی کیفیت کو عذاب اور دنیاوی رسوائی کہا ہے:

(۱)۔ ابوداؤد، باب اخذ الجزیہ۔

ذلک لھم خزی فالدنیا ولھم فی الاخرہ عذاب عظیم۔ (مائدہ: ۵)

یہ ان کیلئے رسوائی ہے دنیا میں اور آخرت میں بڑا عذاب ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کے بعد جب فرعون نے اپنی شہنشاہی کے غرور میں بنی اسرائیل پر مظالم کے پہاڑ توڑنے شروع کیے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں تسلی دی۔

استعینوا باللہ واصبروا ج ان الارض للہ یورثھا من یشاء من عبادہ والعاقبہت للمتقین (اعراف: ۵)

خدا سے مدد مانگو اور ثابت قدم رہو۔ زمین تو خدا کی ہے

(اور) وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اس کا مالک بنا دیتا ہے اور آخر بھلا تو ڈرنے والوں کا ہے۔

بنی اسرائیل نے اس صبر و تسلی پر جو درحقیقت پیشین گوئی کی بشارت تھی، الٹا اضطراب ظاہر کیا تو پھر فرمایا:

عسی ربکم ان یھلک عدو کم ولیستخلفکم فی الارض فینظر کیف تعلمون۔ (اعراف:۱۵)

قریب ہے کہ تمہارا پروردگار تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے، اور اس کی جگہ تمہیں زمین میں خلیفہ بنائے پھر دیکھے تم کیسے عمل کرتے ہو۔

آخر جب وعدہ الٰہی کے پورا ہونے کا وقت آیا تو فرعون کی شہنشاہی کا تخت الٹ گیا اور مصر کی وہی غلام اور بے کس قوم خلافت الٰہی کے تاج سے سرفراز ہوئی:

و اورثنا القوم الذین کانوا یستضعفون مشارق الارض و مغاربھا التی برکنا فیھا وتمت کلمت ربک الحسنی علی بنی اسرائیل بما صبروا (اعراف:۱۳۶)

اور ہم نے اس قوم کو جو کمزور سمجھی جاتی تھی اس زمین کے پورب اور پچھم کا وارث بنا دیا جس میں ہم نے برکت دی اور اللہ کی اچھی بات بنی اسرائیل کے حق میں پوری ہوئی ان کے صبر کی وجہ سے۔

یہ نعمت ان کو حق کی راہ میں صبر و استقلال سے ہاتھ آئی اور دنیا کی برکت اور سرفرازی ان کو ملتی رہی لیکن جب ان کے ہاتھ سے راہ حق میں صبر و استقلال کا دامن چھوٹنے لگا اور پیغمبروں کے ماننے سے منہ پھیرنے لگے تو دفعتاً عزت کا یہ تاج ان کے سر سے اتر گیا، اللہ نے پیشن گوئی فرمائی:

وقضینا الی بنی اسرائیل فی الکتاب لتفسدن فی الارض مرتین ولتعلن علوا کبیرا فاذا جاء وعدا

ولهما بعثنا عليكم عبادالنا اولی باس شدید فجاسوا خلل الدیار و کان وعدا مفعولا ثما رددنا لکم الکره علیهم و امددنا کم باموال و بنین وجعلنا کم اکثر نفیرا ان احسنتم احسنتم لانفسکم و ان اسائتم فلها فاذا جاء وعدالاخره لیسوء ا وجوهکم ولید خلوا المسجد کماد خلوه اول مره ولیتبروا

اور ہم نے بنی اسرائل کو خبردار کردیا تھا کہ تم دو دفعہ زمین میں فساد کرو گے اور بڑی سرکشی کرو گے تو جب ان میں سے پہلے وعدہ کا وقت آیا تو ہم نے ان پر اپنے بڑے سخت بندوں کو بھیجا' تو وہ ملک میں گھس گئے اور اللہ کا وعدہ ہو کر رہتا ہے پھر ہم نے ان پر تم کو پھیرا' اور تم کو مال اور اولاد سے مدد دی اور تمہاری تعداد بڑھائی اور کہہ دیا کہ اگر تم نیکی کرو گے تو اپنے لیئے' اور برا کرو گے تو اپنا' پھر جب دوسرے وعدہ کا وقت آیا تو اوروں کو تم پر ابھارا تا کہ تمہارے منہ بگاڑ دیں' اور بیت المقدس میں ویسے ہی گھس جائیں جیسے (تمہارے پہلے دشمن)

ماعلوا تتبیرا۔ (بنی اسرائیل: ۱)

پہلی دفعہ اس میں گھس گئے تھے اور جس چیز پر غلبہ پائیں اسے تباہ کردیں۔

اہل خبر کو معلوم ہے کہ قرآن پاک میں بنی اسرائیل کے واقعات جہاں اور دوسرے اغراض سے بیان کیے گئے ہیں وہاں ایک غرض یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کے لیئے وہ عبرت کا سبق بنیں اور انہیں معلوم ہو کہ اگر وہ بھی خدا کے عہد کو پورا نہ کریں گے تو ان کے ساتھ بھی خدا کا وہی برتاؤ ہو گا۔

اوپر کی آیتوں میں تصریح ہے کہ جب بنی اسرائیل کو خلافت ملی تو انہیں پہلے ہی ہوشیار کر دیا گیا تھا کہ یہ خلافت و سلطنت اسی وقت تک ہے جب تک احکام الٰہی کی

پیروی کی جائے۔ جب تم ان سے منہ پھیرو گے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت بھی تم سے منہ پھیر لے گی' چنانچہ اسلام سے پہلے یہودیوں کی تاریخ میں یہ دونوں موقع پیش آئے' اور دو دفعہ کی شامت اعمال سے بیت المقدس کو پامال اور ان کو ذلیل ومحکوم ہونا پڑا' ایک بابل کے بادشاہ بنوکدنذر معروف بہ بخت نصر کے ہاتھوں' اور دوسری دفعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد رومیوں کے ہاتھوں سے۔

ان آیتوں سے یہ بات ظاہر ہوگئی کہ مذہبی سلطنت کا مٹ جانا' ظالم بادشاہ کے پنجوں میں گرفتار رہنا اور دوسروں کی محکومی جو خود ہمارے ہی برے اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے' دنیا میں اللہ تعالیٰ کی غیظ وغضب کا سبب ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد کے موقع پر ان کو آخر مہلت دی گئی چنانچہ اوپر کی آیتوں کے بعد ہی ارشاد ہوا:

عسی ربکم ان یرحمکم وان عدتم عدنا وجعلنا جھنم للکفرین حصیرا. ان ھذا القران یھدی للتی ھی اقوم ویبشرالمئومنین الذین یعملون الصلحت ان لھم اجرا کبیرا (بنی اسرائیل: ۱)

امید ہے کہ تمہارا پروردگار تم پر رحم کرے گا' اور اگر تم پھر وہی (حرکتیں) کروگے' تو ہم بھی وہی (پہلا سا سلوک) کریں گے اور ہم نے جہنم کو کافروں کے لیئے قید خانہ بنا رکھا ہے' یہ قرآن وہ راستہ دکھاتا ہے جو سب سے سیدھا ہے' اور مومنوں کو جو نیک عمل کرتے ہیں بشارت دیتا ہے کہ ان کے لیئے اجر عظیم ہے۔

یہ رحمت کی امید اسی شرط سے مشروط تھی کہ وہ آخری نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لائیں' لیکن وہ جب اس سے محروم رہے تو رحمت الٰہی بھی دور ہوگئی۔ کیونکہ انہیں سنا دیا گیا:

و اذ اخذنا میثاق بنی اسرائیل لا تعبدون الا اللہ و

بالوالدین احسانا و ذی القربی و الیتمی و المسا کین و قولوا للناس حسنا و اقیموا الصلوہت واتوا الزکوہت تم تولیتم الا قلیلا منکم و انتم معرضون. و اذ اخذنا میثاقکم لا تسفکون دماء کم ولا تخرجون انفسکم من دیار کم ثم اقررتم و انتم تشھدون.

اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا اور ماں باپ اور رشتہ داروں اور یتیموں اور محتاجوں کے ساتھ بھلائی کرتے رہنا' اور لوگوں سے اچھی باتیں کہنا اور نماز پڑھتے اور زکوٰۃ دیتے رہنا' تو چند شخصوں کے سوا تم سب (اس عہد سے) منہ پھیر بیٹھے اور جب ہم نے تم سے عہد لیا کہ آپس میں کشت وخون نہ کرنا اور اپنے کو ان کے وطن سے

ثم انتم ھٰؤلاء تقتلون انفسکم و تخرجون فریقا منکم من دیارھم تظھرون علیھم بالاثم و العدوان. وان یاتوکم اسری تفدوھم وھوا محرم علیکم اخراجھم افتئومنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعضج (بقرہ: ۸۰)

نہ نکالنا' تو تم نے اقرار کرلیا اور تم_ اس بات کے) گواہ ہو' پھر تم وہی ہو کہ اپنوں کو قتل بھی کر دیتے ہو۔ اور اپنے میں سے بعض لوگوں پر گناہ اور ظلم سے چڑھائی کر کے انہیں وطن سے نکال بھی دیتے ہو اگر وہ تمہارے پاس قید ہو کر آئیں تو بدلہ دے کر ان کو چھڑا بھی لیتے ہو' حالانکہ ان کا نکال دینا ہی تم کو حرام تھا (یہ) کیا (بات) ہے کہ تم کتاب (خدا) کے بعض احکام کو مانتے ہو اور بعض سے انکار کیے دیتے ہو۔

''مسجدوں کی ویرانی اور خصوصاً بیت المقدس کی ظاہری و باطنی تباہی کے جرم پر اہل

کتاب کو یہ سزا سنائی گئی:

ومن اظلم ممن منع مسجد الله ان یذکر فیها اسمه وسعی فی خرابها ط اولئك ما کان لهم ان یدخلوها الا خائفین ط لهم فی الدنیا خزی ولهم فی الاخره عذاب عظیم۔ (بقرہ:۱۴)

اور اس سے بڑھ کر کون ظالم ہے جو خدا کی مسجدوں میں خدا کے نام کا ذکر کیے جانے کو منع کرے اور ان کی ویرانی میں ساعی ہو، ان لوگوں کو کچھ حق نہیں کہ ان میں داخل ہوں، مگر ڈرتے ہوئے ان کے لیئے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں بڑا عذاب ہے۔

جو لوگ خدا اور رسول سے لڑتے ہوں اور خدا کی زمین میں فساد اور غارت گری پھیلاتے ہوں، ان کے لیئے دنیا کی سزائیں بھی مقرر کی گئیں اور کہا گیا کہ ان کو مار ڈالا جائے، ان کو سولیوں پر لٹکایا جائے، ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیے جائیں، ان کو ملک سے باہر قید کر دیا جائے:

ذالك لهم خزی فی الدنیا ولهم فی الاخره عذاب عظیم۔ (مائدہ:۵)

یہ تو دنیا میں ان کی رسوائی ہے، اور آخرت میں ان کے لیئے بڑا (بھاری) عذاب (تیار) ہے۔

یہود کے رئیسوں اور عالموں کو جنہوں نے کتاب الٰہی کو چھوڑ کر اپنے رسوم و عادات کو اپنی شریعت بنالیا تھا، یہ سزا سنا دی گئی:

لهم فی الدنیا خزی ولهم فی الاخره عذاب عظیم۔ (مائدہ:۶)

دنیا میں بھی ذلت ہے اور آخرت میں بھی بڑا عذاب ہے۔

اسی طرح وہ لوگ جو کتاب و دلیل کے بغیر اپنے اوہام اور باطل خیالات کی بنا پر دین

میں کج بحثی کرتے ہیں اور دنیاوی جاہ و دولت کے غرور میں حق کی راہ سے منہ پھیرتے ہیں‘ ان کے لیئے بھی آخرت کے عذاب کے علاوہ دنیا کی رسوائی بھی ہے:

ومن الناس من یجادل فی اللہ بغیر علم ولا ھدی ولا کتاب منیر ثانی عطفہ لیضل عن سبیل اللہ لہ فی الدنیا خزی و نذیقہ یوم القیامہ عذاب الحریق۔ (حج: ۱)

اور لوگوں میں کوئی ایسا بھی ہے جو خدا کی شان میں بغیر علم و (دانش) کے اور بغیر ہدایت کے اور بغیر کتاب روشن کے جھگڑتا ہے اور (تکبر سے) گردن موڑلیتا ہے تا کہ (لوگوں کو) خدا کے راستے سے گمراہ کردے‘ اس کے لیئے دنیا میں ذلت ہے اور قیامت کے دن ہم اسے عذاب (آرائش سوزاں) کا مزہ چکھائیں گے۔

یہود نے جب گائے کے بچھڑے کا بت بنا کر پوجا تو موسی علیہ السلام کو وحی الٰہی نے خبردار کردیا:

ان الذین اتخذوا العجل سینالھم غضب من ربھم وذلہت فی الحیوہ الدنیا و کذالک نجزی المفترین۔ (اعراف: ۱۹)

(خدا نے فرمایا) جن لوگوں نے بچھڑے کو معبود) بنالیا ان پر پروردگار کا غضب واقع ہوگا‘ اور دنیا کی زندگی میں ذلت (نصیب ہوگی) اور ہم افترا پردازوں کو ایسا ہی بدلہ دیا کرتے ہیں۔

یہی نہیں بلکہ ہمیشہ کے لئے ذلت‘ قومی مسکنت اور غضب الٰہی کے مستوجب ٹھہرائے گئے‘ کیونکہ انہوں نے احکام الٰہی سے انحراف کیا‘ خدا کے رسولوں کو قتل کرتے اور حدود الٰہی کو توڑتے رہے۔

و ضربت علیھم الذلہت و المسکنہت وباء وہ

بغضب من الله ذلك بانهم كانوا يكفرون بايت الله و يقتلون النبين بغير الحق ذلك بما عصوا و كانوا يعتدون۔ (بقرہ:۷)

اور (آخرکار) ذلت (اور رسوائی) اور محتاجی (و بےنوائی) ان سے چمٹا دی گئی' اور وہ خدا کے غضب میں گرفتار ہو گئے' یہ اس لیے کہ وہ خدا کی آیتوں سے انکار کرتے تھے اور اس کے نبیوں کو ناحق قتل کر دیتے تھے (یعنی) یہ اس لیے کہ نافرمانی کیے جاتے اور حد سے بڑھے جاتے تھے۔

آخر الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کی آمد ان کے لیئے مہلت کا آخری موقع تھا' لیکن ان کی سرکشی بدستور قائم رہی' اس پر خدا نے قیامت تک کے لیئے ذلت و مسکنت اور غیروں کی غلامی ان کی قسمت میں لکھ دی:

ضربت عليهم الذلة اينما ثقفوا الا بحبل من الله وحبل من الناس وباء وابغضب من الله وضربت عليهم المسكنة ذالك بانهم كانوا يكفرون بايت الله ويقتلون الانبياء بغير حق ذلك بما عصوا و كانوا يعتدون۔ (آل عمران:۱۲)

یہاں جہاں نظر آئیں گے ذلت (کو دیکھو گے کہ) ان سے چمٹ رہی ہے بجز اس کے کہ یہ خدا اور (مسلمان) لوگوں کی پناہ میں آ جائیں' اور یہ لوگ خدا کے غضب میں گرفتار ہیں اور ناداری ان سے لپٹ رہی ہے یہ اس لیئے کہ خدا کی آیتوں سے انکار کرتے تھے (اور اس کے) پیغمبروں کو ناحق قتل کر دیتے یہ اس لیئے کہ یہ نافرمانی کیے جاتے اور حد سے بڑھے جاتے تھے۔

دوسری سورہ میں ہے:

و اذا تاذن ربك ليبعثن عليهم الى يوم القيامة

من یسومھم سوء العذاب

اور (اس وقت کو یاد کرو) جب تمہارے پروردگار نے (یہود کو) آگاہ کر دیا تھا کہ وہ ان پر قیامت تک ایسے اشخاص کو مسلط رکھے گا جو ان کو بری بری تکلیفیں دیتے رہیں

ان ربك لسریع العقاب وانه لغفور رحیم۔(اعراف: ۱۲)

بے شک تمہارا پروردگار جلد عذاب کرنے والا ہے اور وہ بخشنے والا مہربان بھی ہے۔

یہود کی پوری تاریخ شروع سے آج تک قرآن پاک کی اس صداقت پر گواہ ہے' تاریخ کا کونسا دور ہے جب ظالم بادشاہوں اور وقت کی بڑی بڑی سلطنتوں کے ہاتھوں انہوں نے اپنے کیے کی سزا نہیں پائی ہے اور آج دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب کی آنکھوں کے سامنے ہے۔

ہمارے مفسروں نے اس دنیاوی عذاب' ذلت' نکبت اور مسکنت کی تفسیر ''جزیہ'' سے' یعنی ان کی دائمی محکومی اور غلامی سے کی ہے قرآن پاک کی دعا میں ہے:

اللھم مالك الملك توتی الملك من تشاء و تنزع الملك ممن تشاء وتعز من تشاء و تذل من تشاء بیدك الخیر۔ (آل عمران: ۴)

اے اللہ! سلطنت کے مالک! تو جس کو چاہے سلطنت دے اور جس سے چاہے چھین لے' جس کو چاہے عزت دے اور جس کو چاہے ذلت دے' تیرے ہاتھ میں سارا خیر ہے۔

ان آیتوں میں لف ونشر مرتب ہے' یعنی ان میں سلطنت کے ملنے کو عزت اور سلطنت کے چھن جانے کو ذلت فرمایا گیا ہے۔

لیکن یہاں ہمارے سمجھنے کے قابل یہ بات ہے کہ یہود پر یہ جو کچھ ہو رہا ہے اور ہوگا اس کا تعلق یہود کی نسل وقومیت سے نہیں' بلکہ ان کے افعال وکردار سے ہے' احکام

الٰہی سے انحراف، انبیاء و مصلحین امت کا قتل و تکذیب، حرص و طمع، سود خواری اور تمام دیگر ذمائم و قبائح جن کی تفصیلات مذکور ہیں، وہ اس کی ذمہ دار ہیں کہ وہ زمین کی وراثت اور خدا کی خلافت کے رتبہ سے ہمیشہ کے لیئے محروم کر دیے گئے، پہلے کہہ دیا گیا تھا:

ان الذین اتخذوا العجل سینالھم غضب من ربھم وذلہت فی الحیوہ الدنیا و کذالک نجزی المفترین۔(اعراف: ۱۹)

(خدا نے فرمایا) جن لوگوں نے بچھڑے کو (معبود بنالیا تھا) ان پر پروردگار کا غضب واقع ہوگا، اور دنیا کی زندگی میں ذلت (نصیب ہوگی) ہم افترا پردازوں کو ایسا ہی بدلہ دیا کرتے ہیں۔

یہ ذلت کا دنیاوی عذاب صرف گائے کے بچہ کے پجاریوں ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ہر اس مفتری کے لیئے ہے جو توحید کا حامل ہو کر غیر کے آستانے کی جبہہ سائی کرے گا اور ارض و سما کے مالک کو چھوڑ کر دنیا کے دوسرے چھوٹے مالکوں کی تلاش و طلب میں دربدر پھرے گا، مگر عزت کا سرمایہ اس کو ہاتھ نہ آئے گا۔

و من یھن اللہ فما لہ من مکرم (حج: ۳)

اور جس کو (اس کے اعمال کے پاداش میں) خدا رسوا کرے اس کو عزت دینے والا کوئی نہیں۔

اللہ تعالیٰ کی موعودہ نعمت کے حصول کا ذریعہ صرف اس کی بندگی ہے، اور یہی اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کا ذریعہ ہے اور اسی کی رضا آخرت میں جنت اور دنیا میں طمانیت اور برکت کی مختلف صورتوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے احکام کو بہ دل و جان قبول اور زبان سے اس کے اعتراف کا نام شروع میں ایمان، اور ان کے مطابق کام کرنے کا نام عمل صالح ہے اور یہی دین اور دنیا کی ہر قسم کی برکتوں کے خزانہ کی کنجی ہے اور اسی طاقت سے آسمان اور زمین سے برکت کا مینہ برستا اور

ان سے پہلے لوگوں کو حاکم بنایا تھا۔

ایک اور جگہ فرمایا:

وعد کم اللہ مغانم کثیرہ تاخذو نہا فعجل لکم ھذہ (فتح:۳)

خدا نے تم سے بہت سی غنیمتوں کا وعدہ فرمایا کہ تم انکو حاصل کروگے سو اس نے غنیمت کی تمہارے لیئے جلدی فرمائی۔

مجاہدین امت کو بشارت ملی کہ دنیا اور عقبیٰ دونوں کی بادشاہی تمہارے ہی لیئے ہے:

یایھاالذین آمنو اھل اد لکم علی تجارہ تنجیکم من عذاب الیم تومنون باللہ ورسولہ وتجاھدون فی سبیل اللہ باموالکم وانفسکم. ذلکم خیر لکم ان کنتم تعلمونلا یغفر لکم ذنوبکم ویدخلکم جنت تجری من تحتھاالانھر ومسکن طیبہ فی جنت عدنط ذالک الفوزالعظیم لا واخری تحبونھا نصر من اللہ و فتح قریبط و بشر المئومنین (الصف:۲)

مومنو! میں تم کو ایسی تجارت بتاؤں جو تمہیں عذاب الیم سے مخلصی دے (وہ یہ کہ) خدا اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور خدا کی راہ میں اپنے مال اور اپنی جان سے جہاد کرو اگر تم سمجھو تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہے وہ تمہارے گناہ بخش دے گا اور تم کو باغہائے جنت میں جن میں نہریں بہہ رہی ہیں اور پاکیزہ مکانات میں جو بہشتہائے جاودانی میں (تیار) ہیں داخل کرے گا یہ بڑی کامیابی ہے اور ایک چیز جس کو تم بہت چاہتے (یعنی تمہیں) خدا کی طرف سے مدد نصیب ہوگی اور فتح عنقریب ہوگی اور مومنوں کو اس کی خوشخبری سنادو۔

یہ فتح ونصرت اس دنیا میں ملنے والی تھی جس کا مقدمہ ام القریٰ مکہ معظمہ کی فتح تھی اور اس کی انتہا ساری دنیا میں اسلام کی سربلندی اور دین الٰہی کی ہر دین پر فوقیت اور

غلبہ۔

هو الذی ارسل رسوله بالهدی و دین الحق لیظهره علی الدین کله (توبہ:۵)

وہی تو ہے جس نے اپنے پیغمبر کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا' تا کہ اس دین کو دنیا تمام دینوں پر غالب کرے۔

یہ پیشین گوئی دو دفعہ سورۂ فتح وسورۂ صف میں دہرائی گئی' ایسا معلوم ہوتا تھا کہ توبہ اور فتح والی پیشین گوئی کفار کے اور سورۂ صف والی اہل کتاب کے مقابلہ میں ہے یہ پیشین گوئی ایک رنگ میں پوری ہو چکی اور ابھی اس کو دوسرے رنگ میں آئندہ پورا ہونا ہے اور یہ مسلمانوں کی دلجمعی اور اطمینان کا باعث ہے لیکن اس کے پورے ہونے کے لیئے مسلمانوں پر سعی وکوشش بھی فرض ہے' بدر وغیرہ غزوات میں فتح کی پیشین گوئی گو مخبر صادق علیہ السلام کی طرف سے دی جا چکی تھی' تاہم مسلمانوں کو اس کے لیئے بھی ویسی ہی کوشش کرنی پڑی جیسا کہ سورۂ فتح کی پیشین گوئی میں اس کی طرف اشارہ موجود ہے۔

وقاتلوهم حتی لاتکون فتنة ویکون الدین کله لله (انفال:۵)

اور لوگوں سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ یعنی کفر کا فساد باقی نہ رہے اور دین سب خدا ہی کا ہو جائے۔

سارا حکم خدا کے لیئے ہو جانے کے معنی یہ ہیں کہ خدا کی اطاعت اور فرمانبرداری کے سوا دنیا میں کسی روحانی وجسمانی قوت کی اطاعت اور حکم برداری نہ رہے' جس کی بھی اطاعت ہو' وہ خدا کی اطاعت کے ضمن اور تحت میں اس کی اجازت اور اس کی رضا سے ہو کر وہ بھی خدا ہی کی اطاعت ہے۔

قرآن پاک میں جگہ جگہ مسلمانوں کو فتح ونصرت اور حصول غنیمت کی بشارت دی گئی ہے جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ وہ شہروں پر قبضہ اور ملکوں پر بادشاہی کریں گے'

دولت کے خزانے ان کے ہاتھ آئیں گے:

لقد رضی اللہ عن المؤمنین اذیبا یعونك تحت الشجرہت فعلم مافی قلوبھم فانزل السکینہت علیھم واثابھم فتحا قریبا و مغانم کثیرہت یا خذونھا و کان اللہ عزیز احکیما. وعد کم اللہ مغانم کثیرہت تاخذو نھا فعجل لکم ھذہ واخری لم تقدر واعلیھا قد احاط اللہ بھا و کان اللہ علی کل شی ء قدیرا۔ (فتح:۳)

(اے پیغمبر)! جب مومن تم سے درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے تو خدا ان سے خوش ہوا' اور جو صدق وخلوص ان کے دلوں میں تھا وہ اس نے معلوم کرلیا تو ان پر تسلی نازل فرمائی اور انہیں جلد فتح عنایت کی' بہت سی غنیمتیں جو انہوں نے حاصل کیں' اور خدا غالب حکمت والا ہے' خدا نے تم سے بہت سی غنیمتوں کا وعدہ فرمایا کہ تم ان کو حاصل کرو گے' تو اس نے غنیمت کی تمہارے لیئے جلدی فرمائی۔۔۔۔اور غنیمتیں بھی جن پر تم قدرت نہیں رکھتے تھے' اور وہ خدا ہی کی قدرت میں تھیں' اور خدا ہر چیز پر قادر ہے۔

یہ فتح وغنیمت جس کے بعجلت پانے کی خبر اس آیت میں ہے وہ خیبر کی فتح ہے' جو بیعت رضوان کے فوراً ہی بعد حاصل ہوئی' اور دوسری فتح اس کے بعد حاصل ہونے کی طرف اشارہ ہے' وہ مکہ کی فتح ہے چنانچہ اسی سفر میں حدیبہ سے واپسی میں یہ خوشخبری مسلمانوں کو سامعہ نواز ہوئی:

انا فتحنالك فتحا مبینا (فتح: ۱)

(اے محمد)! ہم نے تم کو فتح دی' فتح بھی صریح اور صاف۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب دنیا میں نبوت کے فرائض انجام دے چکے اور خانہ کعبہ کے ساتھ سارا عرب بھی بت پرستی کی نجاست سے پاک ہو چکا' اللہ تعالی نے

آپ ﷺ کو اس فتح و نصرت کے وعدے کے پورے ہونے کے بعد عالم آخرت کی طرف متوجہ ہونے کی طرف آمادہ فرمایا:

اذا جاء نصر الله و الفتح ورايت الناس يدخلون في دين الله افواجا فسبح بحمد ربك واستغفره۔ (نصر ۱):

جب اللہ کی مدد اور فتح آ چکی اور تم نے دیکھا کہ لوگ خدا کے دین میں گروہ در گروہ داخل ہو رہے ہیں تو اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح کرو، اور اس سے مغفرت چاہو۔

اسلام کی دعوت شرک کی تردید اور توحید کی تعلیم سے شروع ہوئی اور اس کے بعد شرائع اور احکام آہستہ آہستہ بڑھتے رہے اور اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی، اطاعت اور عبادات کی دعوت، فرائض و حقوق کی ادائی، قلوب و نفوس کی صفائی اور اخلاق کی برتری اور برگزیدگی کی تعلیم و تربیت تدریج کے ساتھ تکمیل کو پہنچتی گئی، ساتھ ہی ساتھ سلطنت کا نظام خود بخود بنتا گیا اور وہ بھی تکمیل کو پہنچ گئی، اس موقع پر ایک شبہہ کا ازالہ ضروری ہے۔

اسلام کے سارے دفتر میں ایک حرف بھی ایسا موجود نہیں جس سے یہ معلوم ہو کہ قیام سلطنت اس دعوت کا اصل مقصد تھا، اور عقائد و ایمان، شرائع اور حقوق و فرائض ہی اصل مطلوب ہیں، اور ایک حکومت صالحہ کا قیام ان کے لیئے وجہ اطمینان اور سکون خاطر کا باعث ہے تاکہ وہ احکام الٰہی کی تعمیل بیباکانہ کر سکیں اس لیئے وہ عرضًا مطلوب ہے، اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد اسی نکتہ کا ترجمان ہے۔

وعد الله الذين امنو وعملو الصلحت ليستخلفنهم في الارض كما استخلف الذين من قبلهم وليمكنن لهم دينهم الذى ارتضى لهم وليبد لنهم من بعد خوفهم امنا يعبدونني لا يشركون بي شيئا۔ (نور:۷)

جولوگ تم سے ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے ان سے خدا کا وعدہ ہے کہ ان کو ملک کا حاکم بنا دے گا جیسا ان سے پہلے لوگوں کو حاکم بنایا تھا اور ان کے دین کو جسے اس نے ان کے لیئے پسند کیا ہے مستحکم و پائیدار کرے گا اور خوف کے بعد ان کو امن بخشے گا' وہ میری عبادت کریں گے اور میرے ساتھ کسی اور کو شریک نہ بنائیں گے۔

اس آیت میں خلافت کے عطا خوف کے بعد امن کی بخشش اور کمزوری کے بعد طاقت کے حصول کی غرض یہ بتائی گئی ہے کہ ہر امر میں اللہ کی عبادت اور اطاعت ہو اور شرک دور ہو' اگر واقعہ اس کے خلاف ہوتا تو یوں کہا جاتا کہ عبادت الٰہی کی تعلیم اور ردشرک کی دعوت اس لیئے ہے کہ خلافت کا قیام ہو اور سلطنت کا حصول ہو۔

تاہم یہ حقیقت ہے کہ اسلام جس دن سے مذہب بنا' اسی دن سے وہ سلطنت بھی ہے اس کی مسجد اس کا دیوان اس کا منبر اس کا تخت تھا' اسلام کے جن بدگمان دشمنوں نے یہ سمجھا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پہلے مذہب کی دعوت پیش کی' جب وہ کامیاب ہونے لگی اور جنگجو عربوں کا ایک گروہ ساتھ ہو گیا تو آپ ﷺ کو سلطنت کے قیام کے فکر ہوئی ان کا یہ خیال سراسر اسلام کی حقیقت سے ناآشنائی پر مبنی ہے' ایسی بادشاہی اور سرداری تو خود قریش کے رئیس آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں اس شرط کے ساتھ پیش کر رہے تھے کہ وہ ان کے بتوں کو برا نہ کہیں' لیکن آپ ﷺ نے ان کی اس درخواست کو ہمیشہ ٹھکرا دیا۔ (۱)۔ کیونکہ آپ ﷺ کی دعوت کا مقصود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی انسانی بادشاہی نہ تھی' بلکہ روئے زمین پر خدائے واحد و برحق کی بادشاہی کا قیام تھا' اسی لیئے اسلام دین و دنیا اور جنت ارضی اور جنت سماوی اور آسمانی بادشاہی اور زمین کی خلافت دونوں کی دعوت کو لے کر اول ہی روز سے پیدا ہوا' اس کے نزدیک عیسائیوں کی طرح خدا اور قیصر دو نہیں ہیں' ایک ہی شہنشاہ علی الاطلاق ہے' جس کے حدود حکومت

میں نہ کوئی قیصر ہے اور نہ کوئی کسریٰ' اسی کا حکم عرش سے فرش تک اور آسمان سے زمین تک جاری ہے وہی آسمان پر حکمران ہے اور وہی زمین پر فرماں رواں ہے:

وھو الذی فی السماء الہ وفی الارض الہ
(زخرف: ۱۰)

اور وہی ہے جو آسمان میں اللہ ہے اور وہی زمین میں بھی اللہ ہے۔

وہ دیویوں اور دیوتاؤں اور نمرودوں اور فرعونوں کو ایک ساتھ ان کے استھانوں اور ایوانوں سے نکالنے کے لیئے آیا تھا اور اس بات کی منادی کرتا تھا کہ آسمان ہو یا زمین پر کوئی قیصر ہوگا اور نہ کسریٰ' جو اس دعوت کی راہ کا روڑا بنے گا اس کو راہ سے ہٹایا جائے گا اور جو اس کو روکنے کے لیئے تلوار اٹھائے گا وہ تلوار سے گرایا جائے گا' سورۂ مزمل کے آخر میں جو آغاز وحی کے زمانہ کی سورہ (۲)۔ ہے' مسلمانوں کو ہوشیار کیا جاتا ہے:

واخرون یضربون فی الارض یبتغون من فضل اللہ
واخرون یقاتلون فی سبیل اللہ۔ (مزمل: ۲)

(اور مسلمانوں میں) وہ لوگ ہوں گے جو زمین میں چلیں گے اللہ کی روزی کی تلاش میں' اور وہ لوگ ہوں گے جو اللہ کی راہ میں لڑنے نکلیں گے۔

یہ جنگ کی پیشین گوئی اس زمانے میں سنائی جارہی ہے جب کسی کو معلوم بھی نہ تھا کہ کبھی اسلام کے پیغام کو تیغ وسنان کی زبان سے بھی سنانے کے نوبت آئے گی' گویا کہ اسلام کے آغاز ہی میں اس کا انجام معلوم تھا کہ لوگ اس دعوت کے قبول سے انکار کریں گے اور اس کو بزور روکنے کی کوشش کریں گے اور آخر مسلمانوں کو ان منکروں اور مخالفوں کے خلاف سربکف میدان میں آنا ہوگا۔

---

(۱) سیرہ ابن ھشام' وفد روسائے قریش کی گفتگو۔ (۲)۔ بعض روایات میں ھے کہ اس سورہ کے اول و آخر میں ایلک سال کا فصل

مکہ میں توحید کا اعلان ہوا تو قریش کے ایک رئیس عتبہ نے دوسرے رئیسوں کے مشورہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آ کر عرض کی' سنو اے میرے بھتیجے! اس نئی دعوت سے تمہارا مقصود اگر مال و دولت ہے تو ہم تمہارے لیئے اتنی دولت جمع کر دیتے ہیں کہ تم ہم سب سے زیادہ دولت مند ہو جاؤ' اور اگر تمہیں اپنی سرداری کا خیال ہے تو ہم تمہیں اپنا سردار مان لیتے ہیں کہ تمہارے فیصلہ کے بغیر کوئی کام نہ کریں گے' اور اگر تمہیں بادشاہ بننے کی فکر ہے تو ہم تمہیں اپنا بادشاہ بنانے کو تیار ہیں' اس کے جواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سورہ فصلت کی آیتیں پڑھیں جن کو سنتے ہی عتبہ حیرت میں آ گیا' اور واپس آ کر قریش سے کہا خدا کی قسم محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) جو کلام پیش کرتے ہیں وہ نہ شاعری ہے' نہ جادو ہے اور نہ کاہنوں کی سی باتیں ہیں' قریشی بھائیو! میری رائے یہ ہے کہ جو کلام میں نے ان کے منہ سے سنا ہے وہ بے اثر نہیں رہ سکتا' اس لیئے تم محمد کو اپنا کام کرنے دو' اگر وہ کامیاب ہو کر عرب پر غالب آ گئے تو ان کی بادشاہی تمہاری بادشاہی اور ان کی عزت تمہاری ہی عزت ہوگی' اور اگر ناکام رہے تو عرب خود ان کا خاتمہ کر دیں گے تمہیں انگلی ہلانے کی ضرورت نہ ہوگی' لیکن رئیسوں نے یہ کہہ کر کہ محمد نے عتبہ پر بھی جادو کر دیا' اس رائے کے ماننے سے بھی انکار کر دیا۔

کچھ دنوں کے بعد مکہ کے بڑے بڑے رئیس پھر اکھٹے ہوئے اور اس دفعہ سب نے مل کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں عرض کی۔

''اے محمد! عرب کا کوئی آدمی ایسا نہ ہوگا جس نے اپنی قوم کو اس مصیبت میں پھنسایا ہو' جس میں تم نے اپنی قوم کو پھنسایا ہے تم باپ دادوں کو برا کہتے ہو' ہمارے مذہب میں عیب نکالتے ہو' ہمارے دیوتاؤں کو گالی دیتے ہو اور ہم کو نادان اور بے عقل بتاتے ہو تم نے ایک نئی بات نکال کر ہماری جماعت

کے اتحاد میں فرق ڈال دیا' تو اگر اس کام سے تمہارا مقصود دولت کمانا ہے تو ہم تمہارے سامنے دولت کا ڈھیر لگا دیتے ہیں' کہ تم ہم سب میں دولت مند بن جاؤ اور اگر سرداری کا خیال ہے تو ہم تم کو سردار مانتے ہیں' اور اگر بادشاہ بننا چاہتے ہو تو ہم تم کو اپنا بادشاہ بنا لیتے ہیں' اور اگر تم پر کسی جن کا سایہ پڑ گیا ہے تو ہم تمہارا علاج کرائیں گے۔''

یہ سن کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

ان میں سے کسی بات کی بھی خواہش نہیں' مجھے نہ تو تمہاری دولت چاہئے' نہ تم پر سردار بننا چاہتا ہوں اور نہ تم پر حکومت کرنا میرا مقصد ہے مجھے تو خدا نے رسول بنا کر تمہارے پاس بھیجا ہے اور ایک کتاب مجھ پر اتاری ہے اور مجھے خدا سے حکم ملا ہے کہ اپنے رب کا پیغام سناؤں اور تمہاری خیر خواہی کا حق ادا کروں' اگر تم اس کو مان لوگے تو دنیا اور دین میں تمہارا بھلا ہوگا اور اگر تم نے نہ مانا تو میں صبر کروں گا' یہاں تک کہ میرے اور تمہارے درمیان خدا کا فیصلہ آ جائے۔

ان دونوں تقریروں سے ظاہر ہو گیا کہ اسلام کا مقصد روم و ایران اور حیرہ و غسان کی طرح کی شخصی یا قومی شان و شوکت کی بادشاہی نہ تھی' جو صلح و آشتی سے آسانی سے قائم ہو سکتی تھی' اس لیئے قریش کی قومی بادشاہی یا حجاز کی وطنی حکومت کی دعوت کا نظریہ پیش کرنا کافی تھا' لیکن معاملہ کی حقیقت اس سے بالکل الگ تھی' یہ دنیا کی اصلاح عالم کا اخلاقی و سیاسی انقلاب اور زندگی کا ایک ایسا نیا نظام تھا جس کی وسعت میں دین کی ہر چیز آ جاتی تھی اور اسی لیئے اس کے لیئے عرب و عجم بلکہ جن و بشر سے قوت آزمائی کرنی تھی۔

قریش کے سردار آخری دفعہ حضرت ابو طالب کی خدمت میں آتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے صلح ہو جائے' ابو طالب بھتیجے سے کہتے ہیں! جان

عم! یہ قریش کے سردار آئے ہیں وہ کچھ شرط تم سے لینا چاہتے ہیں اور وہ کچھ تم کو دینا چاہتے ہیں' ارشاد ہوا: اے عم بزرگوار! میں صرف ایک بات چاہتا ہوں کہ وہ مان لیں جس سے وہ عرب کے بادشاہ ہو جائیں اور عجم ان کے زیر نگیں ہوگا' ابوجہل نے کہا: ہم آپ کی ایک بات نہیں دس باتیں مانیں گے' ارشاد فرمایا کہ یہ مانو کہ ایک اللہ کے سوا کوئی دوسرا اللہ نہیں' اور خدا کے سوا جن کو پوجتے ہو ان سے دست بردار ہو جاؤ۔(۱)۔

حج کے موسم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک ایک قبیلہ کے پاس جا کر توحید کی دعوت دیتے ہیں اور اپنی دعوت کو ان لفظوں میں پیش فرماتے ہیں ''اے لوگو! کہو کہ خدا کے سوا کوئی خدا نہیں' تم فلاح پاؤ گے' عرب تمہاری بادشاہی میں ہوگا اور عجم تمہارے تابع فرمان ہوگا اور تم جنت میں بادشاہ بنو گے (۲)۔

بیعت عقبہ میں جب مکہ والوں کے ڈر سے مکہ کی ایک گھاٹی میں رات کو چھپ کر رسول انام علیہ السلام کے دست مبارک پر چند گنتی کے نفوس جو مدینہ سے آئے تھے' بیعت کر رہے تھے تو انصار میں سے ایک خطیب نے اٹھ کر اپنی ایمانی بصیرت اور فراست سے کہا کہ یہ کیسی عظیم الشان حقیقت کا اظہار ہے' اسعد بن زرارہ انصاری رضی اللہ عنہ' نے حضور ﷺ کے دست مبارک کو پکڑ کر لوگوں سے خطاب کر کے کہا:

لوگو! تم کو معلوم ہے کہ تم آج محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کس بات پر بیعت کر رہے ہو؟ آج تم ان سے اس بات پر بیعت کر رہے ہو کہ تم عرب وعجم بلکہ جن وبشر سے اس کے لیئے لڑنے کو تیار ہو؟ سب نے کہا ہاں! انہوں نے عرض کی کہ یا رسول اللہ اب آپ اپنی شرطیں پیش فرمائیں' ارشاد ہوا: اقرار کرو کہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں اور نماز کھڑی کرو گے' زکوٰۃ دو گے اور میری اطاعت کرو گے اور جو جس کام کا اہل ہوگا اس کو اس سے چھیننے کے لیئے جھگڑا نہ کرو گے' اور جس سے تم اپنی اور اہل وعیال کی حفاظت کرتے ہو میری بھی کرو گے'

انصاری نے ایک آواز سے کہا: ہاں! یا رسول اللہ! آپ کی یہ سب باتیں منظور لیکن ہمیں اس سے کیا ملے گا؟ فرمایا جنت اور فتح ونصرت۔(۳)۔

یہ گویا شروع ہی سے معلوم تھا کہ اسلام کا کلمۂ دعوت دین و دنیا کی بادشاہی کی کنجی ہے اور یہ بھی معلوم تھا کہ اسلام جس صلح کے پیغام کو لے کر نکلا ہے، دنیا اس کا مقابلہ جنگ سے کرے گی، اور آخر تلوار کو تلوار سے گرانا اور دنیا میں اسلام کے نظام کو قائم کرنے کے لیئے عرب وعجم بلکہ جن و بشر میں سے جو راہ کا پتھر بن کر آئے گا اس کو قوت سے توڑنا پڑے گا یہاں تک کہ خدا کا دین اپنے ہر معنی میں پورا ہو جائے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسے زمانہ میں جب کہ اسلام کی دنیاوی طاقت ہنوز دشمنوں سے محصور تھی مختلف موقعوں پر صحابہ کو بڑے بڑے شہروں اور ملکوں کی فتوحات کی خوشخبریاں دیں، جس کے صاف معنی یہ ہیں کہ حضور ﷺ کو ان واقعات کا علم دیا گیا تھا، انہیں معلوم تھا کہ جب مسلمان اللہ تعالیٰ کے عہد کو پورا کریں گے تو وہ اپنا عہد بھی پورا کرے گا اور دنیا کی بادشاہیاں ان کے ہاتھوں میں اور بادشاہوں کے تاج ان کے پاؤں میں ڈال دے گا۔

---

(۱)۔سیرہ ابن ہشام۔ (۲)۔ طبقات ابن سعد ج ا ص ۱۴۵، لائیڈن۔
(۳)۔ طبقات ابن سعد جزء ثالث بدریین قسم ثانی ص ۱۳۹، لائیڈن۔

---

غزوۂ احزاب میں جو ہجرت کے چوتھے سال پیش آیا، مٹھی بھر مسلمان جو مدینہ کی کھلی آبادی میں تھے، جملہ آور عربوں کے نرغے میں گھر رہے ہیں دم بہ دم خبریں آ رہی ہیں کہ سارا عرب اپنی پوری متحدہ طاقت سے سیلاب کی طرح مدینہ پر امنڈتا چلا آ رہا ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور جان نثار صحابہ بھوکے پیاسے مدینہ کی حفاظت کی خاطر شہر کے چاروں طرف خندق کھود رہے ہیں کہ ایک بھاری پتھر سامنے آ جاتا ہے جس کو مسلمانوں کے پھاوڑے اور کدالیں راہ سے ہٹانے سے عاجز ہو رہی ہیں، حضور ﷺ تشریف لاتے ہیں اور اس زور سے اس پر تین دفعہ ایسی ضرب کاری لگاتے ہیں کہ پتھر چور چور ہو جاتا ہے اور لوہے اور پتھر کی رگڑ سے ہر

آرائش کے لیئے ہے' دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ یہ کھیتی دنیا کے لیئے ہے تو آخرت کے آرام سے محرومی ہوگی اور اگر آخرت کے لیئے ہے تو دنیا اور آخرت دونوں ہی کے لیئے فوز وفلاح کا موجب ہے:

(۱) ان واقعات کے حوالے سیرہ النبی ﷺ جلد سوم میں پیشین گوئیاں کے بیان میں ھیں۔

من کان یرید حرث الاخرہت نزد له فی حرثه و من کان یرید حرث الدنیا نئوته منها و ماله فی الاخرہت من نصیب (.شوریٰ:۳)

جو شخص آخرت کی کھیتی کا خواستگار ہو' اس کو ہم اس میں سے دیں گے اور جو دنیا کی کھیتی کا خواستگار ہو اس کو ہم اس میں سے دیں گے اور اس کا آخرت میں کچھ حصہ نہ ہوگا۔

ومن یرد ثواب الدنیا نئوته منهاو من یرد ثواب الاخرہت نوته منها وسنجزی الشاکرین۔ (آل عمران:۱۵)

اور جو شخص دنیا میں اپنے اعمال کا بدلہ چاہے اس کو ہم یہیں بدلہ دے دیں گے' اور جو آخرت میں طالب ثواب ہو اس کو وہاں اجر عطا کریں گے اور ہم شکر گزاروں کو عنقریب بہت اچھا صلہ دیں گے۔

یہی سبب ہے کہ مسلمانوں کو ہر قدم پر ہشیار کیا گیا ہے کہ دولت فانی کے پیچھے دولت باقی کو مت بھولو' کیونکہ یہاں کی لذت' عیش وعشرت' آرام اور راحت اور دولت و سلطنت آخرت کے لذائذ' ثواب اور نعمتوں کے مقابلہ میں ہیچ ہیں:

والذین هاجروا فی الله من بعد ما ظلموا لنبوئنهم فی الدنیا حسنہت ولاجرالاخرہت اکبر (نحل:٦)

اور جن لوگوں نے ظلم سہنے کے بعد خدا کے لیئے وطن چھوڑا' ہم ان کو دنیا میں اچھا ٹھکانا دیں گے اور آخرت کا اجر تو بہت بڑا

ہے۔

جولوگ اپنی غلطی سے دنیا کے فانی معاوضہ کو آخرت کے باقی معاوضہ کے مقابلہ میں ترجیح کے قابل سمجھتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو ان لفظوں میں ہشیار فرمایا:

ارضیتم بالحیوہت الدنیا من الاخرہت فما متاع الحیوہت الدنیا فی الاخرہت الا قلیل (توبہ:۶)

کیا تم آخرت کو چھوڑ کر دنیا کی زندگی پر خوش ہو گئے تو دنیا کی زندگی کا فائدہ آخرت میں بہت معمولی ہے۔

وما اوتیتم من شیء فمتاع الحیوہت الدنیا وزینتھا وما عنداللہ خیر و ابقیط افلا تعقلون (قصص:۶)

اور جو چیز تم کو دی گئی ہے وہ دنیا کی زندگی کا فائدہ اور اس کی زینت ہے اور جو خدا کے پاس ہے، وہ بہتر اور باقی رہنے والی ہے، کیا تم نہیں سمجھتے۔

بل توثرون الحیوہت الدنیا والاخرہت خیر و ابقی (اعلی:۱)

مگر تم لوگ دنیا کی زندگی کو اختیار کرتے ہو حالانکہ آخرت بہت بہتر اور پائندہ تر ہے۔

والدار الاخرہت خیر للذین یتقون افلا تعقلون۔ (اعراف:۲۱)

اور آخرت کا گھر پرہیزگاروں کے لیئے بہتر ہے کی تم سمجھتے نہیں۔

اسی طرح دنیا کی ہر تکلیف سے آخرت کی سزائیں بڑھ کر ہیں:

فاذاقھم اللہ الخزی فی الحیوہت الدنیا ولعذاب الاخرہتاکبر لو کانوا یعلمون. (زمر:۳)

پھر ان کو خدا نے دنیا کی زندگی میں رسوائی کا مزہ چکھا دیا اور آخرت کا عذاب تو بہت بڑا ہے کاش! یہ سمجھ رکھتے۔

ولعذاب الاخرہت اشد و ابقی (طہ:۷)

اور آخرت کا عذاب بہت سخت اور بہت دیر رہنے والا ہے۔

اگر آخرت کا خیال کیے بغیر دنیا کے ذرہ ذرہ پر کوئی حکمرانی بھی کر لے اور دنیا کے مال و دولت سے اپنا گھر بھی بھرے تو اس کی یہ ساری محنت اکارت اور یہ ساری دولت وحشمت بے سود۔

من کان یرید الحیوہت الدنیا وزینتہا نوف الیہم اعمالہم فیہا وہم فیہا لایبخسون . اولئک الذین لیس لہم فی الاخرہت الا النار وحبط ما صنعوا فیہا وبطل ما کانو یعملون۔ (ہود:۲)

جو لوگ دنیا کی زندگی اور اس کی زیب و زینت کے طالب ہوں، ہم انکے اعمال کا بدلہ انہیں دنیا ہی میں دے دیتے ہیں اور اس میں ان کی حق تلفی نہیں کی جاتی یہ وہ لوگ ہیں جن کے لیئے آخرت میں آتش جہنم کے سوا اور کچھ نہیں، اور جو عمل انہوں نے دنیا میں کیے سب برباد اور جو کچھ وہ کرتے ہیں سب ضائع۔

دنیا کی ساری بادشاہی آخرت کی نعمتوں کے مقابلوں میں پرکاہ سے بھی کمتر ہے:

فما متاع الحیوہت الدنیا فی الاخرہت الا قلیل۔ (توبہ:۶)

دنیا کی زندگی کے فائدے تو آخرت کے مقابل بہت ہی کم ہیں۔

وما الحیوہت الدنیا فی الاخرہت الا متاع (رعد:۳)

اور دنیا کی زندگی کی آخرت کی مقابلہ میں بہت تھوڑا فائدہ ہے۔

اگر دنیا کے ساتھ آخرت کی دولت نہ ہو تو یہ دنیا لذت فریب اور دھوکے کے سوا کچھ نہیں:

وما الحیوہت الدنیا الا متاع الغرور۔ (آل عمران: ۱۹۱، حدید: ۲۰)

اور دنیا کی زندگی تو دھوکے کا سامان ہے۔

اسلام یہ ہے کہ دنیا کو دنیا کے لیئے نہیں، بلکہ دنیا کو آخرت کے لیئے برتنا چاہئے جمعہ کے خطبوں میں یہ اکثر دہرایا جاتا ہے۔

ان الدنیا خلقت لکم وانکم خلقتم للاخرہت

دنیا تمہارے لیئے پیدا کی گئی ہے اور تم آخرت کے لیئے پیدا کیے گئے ہو۔

قرآن نے یہ بھی بتایا ہے کہ گو دنیا کی ساری چیزیں انسانوں کے لیئے ہیں:

ھو الذی خلق لکم مافی الارض جمیعا۔

وہی تو ہے جس نے سب چیزیں جو زمین میں ہیں تمہارے لیئے پیدا کیں۔

پھر دوسری جگہ بتایا کہ خود انسان کس لیئے بنا:

وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون (الذاریات: ۳۰)

اور میں نے جنوں اور انسانوں کو اس لیئے پیدا کیا کہ وہ میری عبادت کریں۔

دنیا اور دنیا کی ساری چیزیں انسانون کو اس لیئے ملیں کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کا ذریعہ بنایا جائے دنیا کے کاموں سے آخرت کی نعمتیں ہاتھ آئیں، یہ دنیا کی دولت اسی لیئے دی گئی ہے کہ اس سے آخرت کا سودا حاصل کیا جائے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قارون کے قصہ میں بنی اسرائیل کے چند مومنوں کی زبان سے اس حقیقت کو یوں ظاہر فرمایا ہے:

وابتغ فی ما اتٰک اللہ الدار الاخرہت ولا تنس نصیبک من الدنیا۔ (قصص: ۷۷)

اور خدا نے تجھے دنیا میں جو کچھ دیا ہے اس سے آخرت کو

ڈھونڈ اور دنیا سے اپنا حصہ مت بھول۔

انہی معنوں میں الدنیا مزرعۃ الاخرۃ (دنیا آخرت کی کھیتی ہے) کا فقرہ زبان زد ہے۔

قرآن پاک کی وہی آیتیں جن میں اہل ایمان کو دنیاوی بادشاہی اور فتح و کامرانی کی خوشخبری دی گئی ہے، ہمارے مقصد کو واضح کرنے کے لیئے ہیں، فرمایا گیا:

وعداللہ الزین امنوا وعملوا اصلحت لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم ولیمکنن لھم دینھم الذین ارتضی لھم ولیبد لنھم من بعد خوفھم امنا یعبدو ننی لایشر کون بی شیاط ومن کفر بعد ذلک فاولئک ھم الفاسقون . واقیموا الصلوہت واتوا الز کوہت اطیعوا الرسول لعلکم ترحمون۔ (نور:۷)

جو لوگ تم میں سے ایمان لائے اور نیک کام کرتے رہے ان سے خدا کا وعدہ ہے کہ ان کو ملک کا حاکم بنا دے گا جیسا ان سے پہلے لوگوں کو حاکم بنایا تھا، اور ان کے دین کو جسے اس نے ان کے لیئے پسند کیا ہے، مستحکم و پائیدار کرے گا، اور خوف کے بعد امن بخشے گا، وہ میری عبادت کریں گے اور میرے ساتھ کسی اور کو شریک نہ بنائیں گے اور جو اس کے بعد کفر کرے تو ایسے لوگ بدکردار ہیں اور نماز پڑھتے رہو اور زکوٰۃ دیتے رہو، اور پیغمبر خدا کے فرمان پر چلتے رہو تا کہ تم پر رحمت کی جائے۔

خدا نے ایمان اور عمل صالح والوں کو زمین کی سلطنت، تمکین اور امن عطا فرمائے جانے کے غرض بتائی ہے، تا کہ وہ ہر مانع اور مخالف طاقت سے بے پرواہ ہو کر میری اطاعت، عبادت اور میرے احکام کی بجا آوری اور میرے قانون کے اجراء میں

لگے رہیں' اور اگر اس امن و اطمینان اور مانع طاقتوں کے استیصال کے بعد بھی احکام الٰہی سے کوئی سرتابی کرے گا تو وہ نافرمان ٹھہرے گا' نماز کا قیام' زکوٰۃ کا انتظام اور رسول کی اطاعت اللہ کی رحمت کے حصول کا ذریعہ ہے۔

دوسری جگہ فرمایا:

الذین ان مکنھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر وللہ عاقبۃ الامور۔ (حج:٦)

یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو ملک میں دسترس دیں تو نماز پڑھیں اور زکوٰۃ ادا کریں اور نیک کام کرنے کے حکم دیں اور برے کاموں سے منع کریں اور سب کاموں کا انجام خدا ہی کے اختیار میں ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کو زمین میں قوت عطا فرمانے کا مقصد یہ ہے کہ وہ نماز کو جو حقوق الٰہی کی بجا آوری کا سرعنوان ہے قائم کریں' اور زکوٰۃ جو بندوں کے ادائے حقوق کا دوسرا نام ہے ادا کریں' اور دنیا میں امور خیر کی تعمیل اور امور شر کے انسداد کا اہتمام کر سکیں' اسلامی سلطنت کا مقصد نہ جزیہ کا حصول نہ خراج کا وصول' نہ غنیمت کی فراوانی' نہ دولت کی ارزانی' نہ تجارت کا فروغ نہ جاہ و منصب کا فریب' نہ عیش و عشرت کا دھوکہ اور نہ شان و شوکت کا تماشہ ہے' بلکہ سرتاسر حقوق اللہ اور حقوق العباد کی بجا آوری اور اس کے لیئے جد و جہد اور سعی و محنت کی ذمہ داری کا نام ہے۔

# عہد نبوی ﷺ میں نظام حکومت

عام خیال یہ ہے کہ اسلام کو عرب میں ایک عادلانہ نظام حکومت قائم کرنے میں جو دشواریاں پیش آئیں وہ تمام تر اہل عرب کی وحشت، بداوت اور جہالت کا نتیجہ تھیں، لیکن درحقیقت اس سے زیادہ یا اسی کے برابر خود وقت کا تمدن بھی اسلام کے عادلانہ نظام حکومت کا دشمن تھا اور اس کی مخالفت وحشت سے زیادہ اور دیرپا تھی، چنانچہ ۸ ہجری میں فتح مکہ کے بعد اگرچہ وحشی عربوں نے اسلام کے سامنے اپنی گردنیں جھکا دیں لیکن وقت کے تمدن کا سر پرغرور اب تک بلند تھا، چنانچہ نامہ اقدس کے جواب میں شہنشاہ ایران کا جواب اور قیصر روم کے حامیوں کے مقابلوں میں غزوۂ موتہ وغیرہ واقعات جو ۹ھ میں پیش آئے اور اس کے بعد خلافت راشدہ میں ایرانیوں اور رومیوں سے لڑائیاں اسی سرکشی وتمرد کا نتیجہ تھیں۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ چھٹی صدی عیسوی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعثت اور اسلام کے ظہور کا زمانہ ہے، دنیا کی تمام سیاسی قوتیں مشرق ومغرب کی دو عظیم الشان طاقتوں کے زیر سایہ تھیں، مشرق کی نمائندگی فارس کی کسرٰی اور مغرب کی قسطنطنیہ کے قیصر کر رہے تھے اور ان دونوں کے ڈانڈے عرب کے عراقی وشامی حدود پر آکر ملتے تھے، عرب کے وہ قبائل جن میں ذرا بھی تہذیب وتمدن کا نام نہ تھا، وہ انہی دونوں میں سے کسی کے زیر اثر اور تابع تھے، یمن، بحرین، عمان اور عراق ایرانیوں کے اور وسط عرب اور حدود شام رومیوں کے ماتحت یا زیر اثر تھے۔

چنانچہ لخمی خاندان نے مقام حیرہ میں ایرانیوں کی ماتحتی میں ایک وسیع سلطنت قائم کی تھی، جس کے فرمانروا نعمان بن منذر وغیرہ تھے، غسانی خاندان جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ تک قائم رہا، رومیوں کی سرپرستی میں حدود شام پر حکومت کرتا تھا۔ یمن میں مدت تک خود عرب کی مستقل خاندانی ریاستیں قائم تھیں لیکن آخر زمانہ میں یمن خود ایرانیوں کے علم کے نیچے آگیا تھا، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ

وآلہ وسلم کے زمانہ میں یمن میں باذان نامی ایرانی حاکم موجود تھا' عرب پر ان سلطنتوں کا اس قدر اقتدار قائم ہو چکا تھا کہ خود عربوں کے ذہن میں جب کسی نظام سلطنت یا نظام تمدن کا خیال آتا تھا تو اسی ایرانی یا رومی نظام سلطنت اور نظام تمدن کا آتا تھا' ان سے الگ یا ان سے بالاتر تھا۔

اس بنا پر اسلام عرب میں جو نظام حکومت قائم کرنا چاہتا تھا' اس کے لیئے صرف یہی کافی نہ تھا کہ عرب کی قدیم وحشت کو مٹا کر اسلامی تہذیب وتمدن کی داغ بیل ڈالی جائے۔ بلکہ سب سے مقدم کام یہ تھا کہ عرب کو غیر قوموں کے دماغی تسلط' سیاسی مرعوبیت اور ان کے اخلاقی وتمدنی اثر سے آزاد کرایا جائے بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر نہ صرف عربوں کو' بلکہ سارے عالم کو انسانوں کے خود ساختہ قانون کی غلامی سے نکال کر قانون الٰہی کی اطاعت وفرمانبرداری میں دے دیا جائے اور بتایا جائے کہ قانون الٰہی کو چھوڑ کر دوسرے انسانی قوانین کی پابندی شرک کا دوسرا راستہ ہے لیکن جیسا کہ اسلام کے تمام فرائض واعمال میں ترتیب وتدریج ملحوظ رہی ہے' اسی طرح اسلام کے نظام حکومت میں بھی بتدریج ترقی ہوتی گئی' چنانچہ اگرچہ آپ ﷺ ساری دنیا کی اصلاح کے لیئے آئے تھے مگر آپ ﷺ نے اپنا کام عرب سے شروع کیا' تاکہ ایک ایسی صالح جماعت کا ظہور ہو جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے بھی اور آپ ﷺ کے بعد بھی اس فرض کی تکمیل میں مصروف رہے قرآن پاک کی یہ آیت اسی نکتہ کی طرف اشارہ کرتی ہے:

وکذلک جعلنکم امتہت وسطا لتکونوا شھدآء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدا۔
(بقرہ:۱۷)

اور اسی طرح اے مسلمانوں! ہم نے تم کو بیچ کی امت بنایا تاکہ تم لوگوں کو بتانے والے بنو اور رسول تمہارے بتانے والا ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ رسول اس امت مسلمہ کے لیئے اور یہ امت دوسری قوموں کی ہدایت و راہنمائی اور ان کی تعلیم و تربیت کے لیئے بروئے کار لائی گئی ہے۔

لیکن یہی تدریجی تربیت خود اہل عرب کی اصلاح میں بھی ملحوظ تھی' چنانچہ سب سے پہلے آپ ﷺ نے عرب کے اندرونی حصے یعنی تہامہ' حجاز اور نجد کے لوگوں کے سامنے اسلام کو پیش کیا اور آپ ﷺ کی ۲۳ سالہ زندگی کے تقریباً سولہ سترہ سال انہی قبائل کی اصلاح و ہدایت کے نذر ہو گئے یہی وجہ ہے کہ مدینہ کے نخلستان کی طرح اگرچہ ہجر و یمامہ کے سبزہ زار بھی اسلام کو اپنے دامن میں پناہ دینے کے لیئے آمادہ تھے اور قبائل یمن کے ایک بڑے رئیس طفیل دوسی نے آپ ﷺ کو قبیلہ دوس کے ایک عظیم الشان قلعہ کی حفاظت میں لینا چاہا لیکن آپ ﷺ نے متمدن مقامات کو چھوڑ کر مدینہ کی سنگلاخ زمین کو دارالہجرہ بنایا' وہ اگرچہ منافقین اور یہود کی وجہ سے مکہ سے زیادہ پرخطر تھا اور ابتدا میں مہاجرین رضی اللہ عنہم کے لیئے اس کی آب و ہوا بھی سازگار نہ تھی تاہم آپ ﷺ نے اسی کی طرف ہجرت فرمائی لیکن جب رفتہ رفتہ عرب کیاس حصہ میں کافی طور پر نظام اسلام قائم ہو گیا اور صلح حدیبیہ نے عرب کے مرکز یعنی مکہ کا راستہ صاف کر دیا اور وہ فتح ہو گیا تو اب عرب کے ان حصوں کی طرف توجہ فرمائی گئی۔

عرب کے اندرونی حصوں میں زیادہ تر اسلام کی اشاعت رؤسائے قوم اور سرداران قبائل کے ذریعے سے ہوئی تھی' آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان حصوں میں بھی یہی طریقہ دعوت اختیار فرمایا چنانچہ سب پہلے قرب و جوار کے سلاطین و رؤسا کو اسلام کی دعوت دی کہ اس وقت کے حالات کے لحاظ سے ان میں سے کسی ایک کا اسلام قبول کر لینا ہزاروں لاکھوں آدمیوں کو قبول اسلام پر آمادہ کر دینا تھا' چنانچہ روم کے قیصر کو جو نامہ مبارک آپ ﷺ نے لکھا تھا' اس میں یہ فقرہ تھا کہ اگر تم

نے اس کو قبول نہیں کیا تو تمہاری ساری رعایا کے عدم قبول اسلام کا گناہ بھی تمہاری ہی گردن پر ہوگا' اس سے اگر چہ خود قیصر کا دل نور اسلام سے منور ہو چکا تھا' لیکن وہ اتنا کم تھا کہ تاج مرصع اور تخت زریں کی چمک میں یہ روشنی ماند پڑ گئی' نجاشی بادشاہ حبش نے آپ ﷺ کی رسالت کی تصدیق کی اور اپنے خاندان کے کچھ افراد کا وفد آپ ﷺ کی خدمت میں روانہ کیا' یمن کے تمام روساء نے رفتہ رفتہ اسلام قبول کر لیا' عرب کے حدود میں ایک غسانی سلطنت تھی' آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد مبارک میں اگر چہ پوری طور پر اس کا قلع قمع نہ ہو سکا تاہم غزوہ تبوک نے آپ ﷺ کے جانشینوں کے لیئے اس کا راستہ بھی بہت کچھ ہموار کر دیا تھا اور اب گویا سارا عرب اسلام کے سایہ کے نیچے تھا اور اس کا نظام حکومت سارے عرب پر چھا چکا تھا' اب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کا سب آخری فرض تمام دنیا میں اللہ تعالی کی شہنشاہی کا اعلان تھا' چنانچہ حجتہ الوداع میں آپ ﷺ نے ان بلیغ الفاظ میں اس کا اعلان فرمایا:

الیوم استدار الزمان کھیئتہ یوم خلق اللہ السموات والارض

زمانہ ہر پھر کے اسی مرکز پر آ گیا جس پر وہ اسی دن تھا جس دن خدا نے آسمان و زمین کو پیدا کیا۔

یہ ایک ایسا عظیم الشان انقلاب تھا جس نے تمام خود ساختہ قوانین' سیاسی تکلفات' بدعات اور مظالم سے لبریز شاہانہ نظامہائے سلطنت کو بیخ و بنیاد سے اکھاڑ دیا' اس انقلاب نے نہ صرف قصر کسری و قیصر کی شخصیتوں کا خاتمہ کر دیا' بلکہ خود کسرویت اور قیصریت کو صفحۂ ہستی سے فنا کر دیا' یہی پیشین گوئی ان الفاظ میں ظاہر ہوئی:

اذا ھلک کسری فلا کسری بعدہ واذا ھلک قیصر فلا قیصر بعدہ

جب کسری ہلاک ہو گیا تو اس کے بعد کوئی کسرا نہیں' اور

جب قیصر ہلاک ہوگیا تو اس کے بعد کوئی قیصر نہیں۔

اور اس کے بعد ایک ایسی عادلانہ سلطنت کی بنیاد ڈالی گئی جس کا قانون خدا کا قانون، جس کی حکومت خدا کی حکومت اور جس میں ہر شخص ایک طرح سے خود ہی اپنا حاکم اور خود ہی اپنا محکوم تھا، کیونکہ اسلامی سلطنت بادشاہ اور اس کے خاندان کی ملکیت نہ تھی، بلکہ ملکیت تو صرف ایک خدا کی تھی لیکن اس کی نیابت سارے مسلمانوں کا یکساں حق تھا، یا اس کو یوں کہیے کہ نظام اسلام میں ہر شخص اپنی اپنی جگہ پر اپنی اپنی رعایا کا نگران حاکم ہے، شوہر اپنے اہل وعیال کا، بیوی شوہر کے گھر کی، معلم اپنے شاگردوں کا، آقا اپنے غلاموں کا، غلام اپنے متعلقہ کاموں کا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد مبارک کا کہ **کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ**۔ یعنی تم میں سے ہر شخص نگہبان ہے اور ہر شخص سے اس کے زیر نگرانی اشخاص (رعیت) کے متعلق سوال ہوگا، یہی مطلب ہے اس سے اسلام کے اصول سلطنت کا ایک اساسی نقطۂ نظر سامنے آجاتا ہے۔

دنیا میں جو سلطنتیں قائم ہوئیں یا ہوتی ہیں، ان کا عام قاعدہ یہ ہے کہ ایک فاتح ایک گروہ کو لے کر اٹھتا ہے اور لاکھوں کو تہ تیغ کرکے اپنی طاقت وقوت سے سارے جتھوں کو توڑ کر ہزاروں گھروں کو ویران کرکے سب کو زیر کرکے اپنی سرداری اور بادشاہی کا اعلان کردیتا ہے اور ان تمام خونریزیوں کا مقصد یا تو شخصی سرداری یا خاندانی برتری یا قومی عظمت ہوتی ہے، مگر اسلامی جنگ و جہاد اور اسلامی نظام حکومت کی جدوجہد میں ان میں سے کوئی چیز بھی مطمع نظر نہ تھی، نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شخصی سرداری، نہ خاندان قریش کی بادشاہی نہ عربی سلطنت، نہ دنیا کی مالی حرص وہوس، بلکہ اس کا ایک ہی مقصد تھا، صرف ایک شہنشاہ ارض وسما کی بادشاہی کا اعلان اور ایک فرمان الٰہی کے آگے سارے بندگان الٰہی کی سرافگندگی۔

دنیا میں سلطنتوں کے بانیوں کا مقصد قیام سلطنت کے سوا کچھ نہیں ہوتا، لیکن اسلام

جو سلطنت قائم کرنا چاہتا تھا وہ بجا خود مقصود بالذات نہ تھی' بلکہ اس کے ذریعہ سے دنیا کے تمام ظالمانہ نظام ہائے سلطنت کو مٹا کر جن میں خدا کے بندوں کو بندوں کا خدا ٹھہرا دیا گیا تھا' اس کی جگہ خدا کے فرمان کے مطابق ایک ایسا عادلانہ نظام قائم کرنا مقصود تھا' جس میں خدا کے سوا نہ کسی دوسری ارضی و سماوی طاقت کی سلطنت ہو اور نہ کسی دوسرے کا قانون رائج ہو اور جس میں فرمانروا افرادی شخصیت' قومیت' زبان' نسل' وطن اور رنگ سے اس کا تعلق نہ ہو' بلکہ اس کی جد و جہد کا سارا منشا سلطنت کے قانون' طرز سلطنت' طریق' حکومت اور عدل و انصاف اور احکام کے حق و باطل سے نہ ہو۔

اس مقصد کے لحاظ سے دنیا کی تمام قوموں میں سے عرب کا انتخاب' ان کی ظاہری و معنوی خصوصیات کے سبب سے ہوا' ظاہری تو اس لیئے کہ وہ ایران اور روم کے درمیان واقع تھے جو اس وقت کی فاسد دنیاوی طاقت کے مظہر تھے' اور جن کو توڑنا اور فنا کرنا ضروری تھا اور اس کے لیئے ایسی ہی درمیانی سلطنت کو مٹانے کے لیئے کام میں لائے' کچھ فطری استعداد کی ضرورت تھی اور یہ استعداد ازل ہی سے ان میں ودیعت رکھی گئی تھی عرب کی فطری شجاعت' کوہ شکن عزم و استقلال' زلزلہ انگیز قوت ارادی کا بڑا مقصد یہ تھا کہ یہ اخلاقی عناصر حکومت اسلامیہ کی تعمیر میں کام آئیں' اور ان اوصاف کی جلاء اخلاص' للّٰہیت' صبر و توکل و اعتماد علی اللہ وغیرہ اخلاقی روحانی ہی سے ممکن تھی' اس لیئے اولاً ان کو اس طرز حکومت سے پاک رکھا گیا جس کو دنیا کی سلطنتوں نے اپنی شخصی و خاندانی اور قومی جاہ و جلال' رعب و اقتدار' اور شاہانہ ہیبت کو قائم رکھنے کے لیئے اختیار کر رکھا تھا' مذکورہ بالا اخلاقی محاسن کے وجود و بقا بلکہ ان کی ترقی و نشو و نما کی ایک ہی صورت تھی کہ ایک اللہ کے فرستادہ' مامور من اللہ' ایک پاکباز راہنما' ایک مقدس امیر' ایک معصوم امام کے پر توصحبت اور تعلیم و تربیت سے ان میں ایک ایسا تقوی' ایک ایسا پاک احساس' ایک ایسا روشن ضمیر' ایک ایسا نور ایمان پیدا کیا

جائے جو بغیر کسی قسم کے جبر و اکراہ کے ہر فرد کو احکام الٰہی کے تحت میں سلطنت کے قوانین کی پابندی اور احترام پر خود مجبور کر دے۔

اس اصول پر جو نظام سلطنت قائم کیا جائے گا اس کے لیئے دو شرطیں لازمی ہیں:

۱۔ یہ کہ وہ چند بنیادی اصولوں پر مبنی ہو۔

۲۔ یہ بنیادی اصول صرف خشک انسانی قانون پر مبنی نہ ہوں بلکہ اس کا اساس اولین محض اخلاص قلب اور خدا تعالیٰ کی اطاعت ہو۔

اسلام کا نظام سلطنت انہی اصولوں پر قائم کیا گیا اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے زمانہ تک قائم رہا اس نظام سلطنت کا بڑا نتیجہ یہ تھا کہ اس میں قانون کے رو سے چھوٹے بڑے، اونچے نیچے، کالے گورے اور عربی و عجمی کی تفریق بالکل مٹ گئی، یمن اور بحرین کے ایران نژاد، بخند و حجاز کے عرب، حبش کے حبشی، سب ایک ہی سطح پر کھڑے ہو گئے اور بادشاہی کے وہ تخت جو مشرق و مغرب میں بچھے تھے، الٹ گئے اور اسلام کی سلطنت کا امام اور دوسرے اہلکار حکام حقوق میں عام مسلمانوں کے برابر کر دیے گئے۔

عام خیال یہ ہے کہ اسلام نے قانونی مساوات کی جو سلطنت قائم کی، وہ عرب کے لیئے کوئی نئی چیز نہ تھی کیونکہ اہل عرب فطرتاً خودار تھے اور ان کے قبیلوں میں شیوخ کی ریاست قریب قریب اسی پرواز کی تھی مگر یہ سخت تاریخی غلطی ہے، عرب میں مدت سے تین سلطنتیں قائم تھیں، لخمی، حمیری، غسانی اور یہ سب کی سب اسی طرز کی تھیں جیسی دنیا میں دوسری شاہانہ حکومتیں تھیں، یمن میں سبا اور حمیر کی سلطنتیں بھی اسی قسم پر تھی قبائل کے سردار اگرچہ جمہور کی مرضی یا ذاتی کردار مثلاً شجاعت و فیاضی وغیرہ کی بنا پر انتخاب کیے جاتے تھے لیکن ان کے حقوق بھی عام لوگوں سے ممتاز تھے، چنانچہ لڑائیوں میں جو مال غنیمت حاصل ہوتا تھا اس میں سرداران قبائل کے لیئے خاص حقوق مقرر تھے جن سے اور تمام لوگ محروم تھے، یہی حقوق ہیں جن کو صیفہ مرباع،

تشیطہ اور فقول کہتے ہیں اور اسلام نے انہی کو مٹا کر خمس قائم کیا ہے عام مجالس میں لوگوں کو سرداران قبائل کے سامنے آزادانہ گفتگو کرنے کا بھی حق حاصل نہ تھا' چنانچہ ایک جاہلی شاعر جو مذہبا یہود تھا کہتا ہے:

وتکران سئنا علی الناس قولھم

ولا ینکرون القول حین نقول

اور اگر ہم چاہیں تو لوگوں کی باتوں کو رد کر دیں

اور جب ہم بولیں تو وہ لوگ اس کو رد نہیں کر سکتے

سرداران قبائل اپنے لیئے جس چراگاہ کو مخصوص کر لیتے تھے اس میں دوسرے لوگوں کو قدم رکھنے کا بھی اختیار نہ تھا' چنانچہ حرب بسوس اسی بنا پر واقع ہوئی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو یہ فرمایا ہے:

لاحمی الاحمی اللہ ورسولہ۔ اللہ اور رسول کے سوا کسی شخص کو چراگاہ کے مخصوص کر لینے کا حق حاصل نہیں ہے۔

اس کا مقصد اسی رسم کا مٹانا تھا۔

سلاطین شاہانہ شان وتجمل سے اونچے محلوں اور ایوانوں میں بڑے بڑے قیمتی لباسوں اور سونے چاندی اور زر وجواہر کے زیوروں سے آراستہ ہو کر اونچے اونچے بیش بہا تختوں پر جلوس کرتے تھے ان کے امراء علی قدر مراتب سونے چاندی کی مرصع کرسیوں پر اور ریشمی گدوں پر بیٹھتے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم نے یک قلم ان مصنوعی تفریقوں کو مٹا دیا' نشست کے لیئے سونے چاندی کا سامان اور ریشمی لباس وفرش حرام کیے گئے' سونے چاندی کے زیورات مردوں کے لیئے حرام ٹھہرائے' امام وقت اور اس کے احکام کے لیئے مسجد اور اس کا صحن ایوان تھا' حاجب و دربان کے پہرے اٹھ گئے' چاؤش ونقیب رخصت کر دیے گئے' طلائی ونقرئی و زمردیں تخت اٹھوا دیے گئے' امام اور اس کے حاکم عام مسلمانوں کے ساتھ کاندھے

سے کاندھا ملا کر نشست کرتے تھے' اور پستی و بلندی کی تفریق باقی نہیں رکھی گئی' چنانچہ وضع لباس کے لحاظ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور عام صحابہؓ میں کسی قسم کا فرق مراتب موجود نہ تھا' ایک مرتبہ ایک صحابیؓ ایک شاہی عبا لے کر آئے' چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عرب کے مختلف حصوں سے وفود حاضر ہوا کرتے حضرت عمر رضی اللہ عنہ' نے عرض کی یا رسول اللہ ! آپ اسے خرید لیں تا کہ جب دوسرے شہر یا ملکوں سے وفود آپ کی خدمت میں آئیں تو آپ اس کو زیب تن فرمالیں یا جمعہ کے دن جو گویا مسلمانوں کے دربار عام کا دن ہے' آپ اس کو پہنیں' اس وقت حضرت عمرؓ کی نظر اسلام کے لیئے اس ظاہری جاہ و جلال اور تزک و احتشام پر گئی جس کے شاہان وقت عادی تھے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اشتباہ کے اس پردے کو فوراً چاک کر دیا کہ مسلمانوں کا پیشوا شاہانہ جاہ و جلال کے اظہار کے لیئے مبعوث نہیں ہوا ہے' آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص اس کو پہنتا ہے آخرت میں اس کا کچھ حصہ نہیں ہے۔

اسی طرح نشست میں بھی آپ ﷺ نے تفوق و برتری کے امتیاز کو اس قدر مٹایا کہ مجلس کے اندر آپ ﷺ میں اور ایک عام آدمی میں کوئی فرق نظر نہیں آتا تھا' چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب صحابہؓ کی مجلس میں بیٹھتے تو باہر سے آنے والوں کو پوچھنا پڑتا کہ تم میں محمد ﷺ کون ہیں' لوگ اشارہ سے بتاتے' صحابہؓ نے چاہا کہ کم از کم ایک چبوترہ ہی بنا دیا جائے' جس پر آپ جلوہ افروز ہوں' مگر اس کو بھی آپ ﷺ نے پسند نہیں فرمایا۔

اس وقت کی شاہانہ حکومتوں میں بادشاہ اور بادشاہی خاندان کے افراد قانون کی زد سے مستثنیٰ تھے' مگر یہاں یہ حال تھا کہ ہر قانون الٰہی کی تعمیل کا اصل نمونہ اس کا رسول اور اہل بیت رسول تھے' اور اللہ تعالیٰ کا حکم تھا کہ اگر نعوذ باللہ اہل بیت سے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہو' تو ان کے لیئے دوہری سزا ہے۔ ایک بار ایک مخزومی خاتون فاطمہ

بنت قیس نے چوری کی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا' چونکہ وہ معزز خاندان کی بی بی تھیں صحابہؓ کو یہ گراں گزرا اور انہوں نے آپ ﷺ کی خدمت میں حضرت اسامہؓ بن زید کے ذریعہ سے سفارش کرانی چاہی' آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم سے پہلے کی قومیں اسی لیئے تباہ ہوئیں کہ جب کوئی معمولی آدمی کوئی جرم کرتا تھا تو اس کو اس کی سزا دے دی جاتی تھی مگر جب وہی جرم بڑے رتبہ کے لوگ کرتے تھے تو ان کو چھوڑ دیتے تھے' پھر فرمایا کہ اگر محمد ﷺ کی بیٹی فاطمہؓ بھی یہ جرم کرتی تو میں یقیناً اس کا ہاتھ کاٹتا۔ (۱)۔

ایک بار آپ ﷺ صحابہ کو مال تقسیم فرما رہے تھے' ایک آدمی آیا اور حرص کے مارے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اوپر ٹوٹ پڑا' آپ ﷺ کے ہاتھ میں کھجور کی چھڑی تھی' آپ ﷺ نے اس سے کونچ دیا جس کی وجہ سے اس کے چہرے پر زخم آ گیا' آپ ﷺ نے دیکھا تو اسی وقت فرمایا کہ آؤ اور مجھ سے قصاص لو' لیکن اس نے کہا کہ یا رسول اللہ! میں نے معاف کر دیا۔ (۲)۔

ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس بہت سی لونڈیاں آئیں' حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں میں چکی پیستے پیستے چھالے پڑ گئے تھے' انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے ہاتھ دکھائے اور فرمایا کہ گھر کے کام کاج کے لیئے ان میں سے ایک لونڈی عنایت فرمایئے لیکن آپ ﷺ نے فرمایا کہ بدر کے یتیم تم سے زیادہ اس کے مستحق ہیں۔ (۳)۔ ابطال سود کا جب حکم آیا تو سب سے پہلے آپ ﷺ نے اپنے چچا حضرت عباسؓ کے تمام سودی معاملات کو باطل قرار دیا' جاہلیت کے انتقام کے مٹانے کا جب قانون عام نافذ ہوا تو سب سے پہلے اول اپنے ہی خاندان کا انتقام جو دوسرے قبیلہ پر باقی چلا آتا تھا' معاف فرمایا' اسلامی محاصل زکوٰۃ و صدقات عشر وغیرہ کے مستوجب ہونے اور ان کی ادائیگی میں خاندان نبوت بھی بالکل عام مسلمانوں کی طرح شریک تھا۔

اسی طرح بادشاہوں نے لوگوں کے دلوں میں اپنی عالی نسبی اور بلندی کا یہ تصور پیدا کر دیا تھا کہ وہ گویا ساری مخلوقات سے افضل ہیں، بخلاف اس کے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے لیئے جو خاص خطاب خدا سے پایا وہ یہ ہے کہ آپ ﷺ اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں، عبدیت کاملہ ہی آپ ؐ کا کمال تھا، اعزاز کے وہ وہمی طریقے جن کا سلاطین نے اپنے کو ایک زمانہ سے مستحق قرار دیا تھا، آپ ؐ نے ان سب کو مٹا دیا، فرمایا: خدا کے نزدیک سب سے برا نام یہ ہے کہ کوئی اپنے کو شاہ شاہان کہے، ایک دفعہ آپ ﷺ کو کسی نے سیدنا کہا تو فرمایا: یہ تو اللہ کے لیئے ہے، آپ ﷺ کو یہ بھی پسند نہ تھا کہ لوگ آپ ﷺ کو دوسرے انبیاء علیہم السلام پر فضیلت دیں۔

(۱)۔یہ حدیث بخاری کے متعدد ابواب میں موجود ھے مثلاً کراھتہ الشفاعھت فی الحدود اذا رفع الی السلطان۔ (۲)۔ ابوداؤد ج ۲ ص ۱۵۸، کتاب الحدود (۳)۔ ابوداؤد۔

ایک بار سورج میں گہن لگا، چونکہ اسی دن آپ ؐ کے صاحبزادہ ابراہیمؓ کا انتقال ہو چکا تھا اور عرب کا خیال تھا کہ جب کسی بڑے آدمی کا انتقال ہوتا ہے تو سورج میں گہن لگ جاتا ہے، اس لیئے لوگوں نے اس واقعہ کو حضرت ابراہیمؓ کی موت کی طرف منسوب کر دیا، لیکن جب آپ ؐ صلوٰۃ کسوف سے فارغ ہوئے تو ایک خطبہ دیا جس میں اس خیال کی تردید کی اور فرمایا کہ چاند اور سورج خدا کی دو نشانیاں ہیں، کسی کی موت وحیات سے گہن نہیں لگتا۔ (۱)۔

ایک بار ایک شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس پر اس قدر رعب نبوت طاری ہوا کہ جسم میں رعشہ پڑ گیا آپ ﷺ نے فرمایا کہ ڈرو نہیں، میں تو اسی عورت کا لڑکا ہوں جو خشک کیا ہوا گوشت کھایا کرتی تھی۔

ایک بار ایک شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں ایک قیدی لایا گیا، اس نے کہا خدایا میں تیری طرف رجوع کرتا ہوں، محمد ﷺ کی طرف رجوع نہیں کرتا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس کو یہ معلوم ہو گیا کہ یہ حق کس کا تھا۔ (۲)۔ حالانکہ

یہ وہ فقرہ ہے جس پر سلاطین کی عدالت گاہوں سے پھانسی کی سزا تک دی جا سکتی تھی کہ اس سے ان کے نزدیک ذات شاہانہ کی توہین متصور ہوتی ہے۔

ایک بار آپ ﷺ نماز پڑھ رہے تھے' حالت نماز ہی میں ایک بدو نے کہا: ''خداوندا! مجھ اور محمد ﷺ پر رحم فرما اور ہم دونوں کے ساتھ کسی پر رحم نہ کر۔'' آپ ﷺ نے سلام پھیرنے کے ساتھ ہی بدو کو ٹوکا کہ ''تم نے ایک وسیع چیز یعنی رحمت الٰہی کو محدود کر دیا۔ (۳)۔ حالانکہ اس نے درباری زبان میں شاہانہ وفاداری کی سب سے بڑی علامت کا اظہار اس فقرہ میں کیا تھا' جس پر سلاطین زمانہ اکرام و انعام کی بارش کرتے تھے۔

سلطنت کے مفتوحات و محاصل کو دنیا کے بادشاہوں نے ہمیشہ اپنی ذاتی **ملک** سمجھا اور اپنے ذاتی و خاندانی عیش و آرام کے سوا ان کا کوئی دوسرا مصرف ان کے نزدیک نہ تھا اور اگر وہ اس میں سے دوسروں کو کچھ دیتے تھے تو اس کو اپنا احسان سمجھتے تھے لیکن جو نظام سلطنت اسلام نے قائم کیا تھا اس میں سلطنت کے سارے محاصل مال اللہ یعنی اللہ کا مال کہلاتے تھے اور وہ صرف بیت المال کی ملکیت تھے اور مسلمانوں ہی کے لیئے تھے' زکوٰۃ صدقہ' خراج اور جزیہ جو کچھ وصول ہوتا تھا وہ اگرچہ بحیثیت امیر سلطنت سب کا سب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ میں آتا تھا' لیکن آپ ﷺ نے اس کو اپنا نہیں' بلکہ باختلاف شرائط عام مسلمانوں کی ملکیت قرار دیا اور کبھی اس کو اپنے شخصی تصرف میں نہیں لائے' زکوٰۃ کی ساری رقم اپنے اور اپنے اہل وعیال اور اپنے خاندان ہاشم پر حرام فرما دی اور اس کو بحکم الٰہی عام غرباء اور اہل حاجت کا حق قرار دیا اور اس کو علانیہ ظاہر فرمایا' ابوداؤد میں ہے:

قال ما اوتیکم من شیء وما امنعکم ان انا الا خازن اضع حیث ما امرت۔ (۴)۔

میں تم کو نہ کچھ دے سکتا ہوں نہ کچھ روک سکتا ہوں' میں صرف خزانچی ہوں' جس موقع پر صرف کرنے کا مجھے حکم دیا جاتا ہے

وہاں صرف کرتا ہوں۔

(۱)۔بخاری باب الکسوف (۲)۔ مسند ج ۳ ص ۴۳۵ مسند اسود بن الشریح (۳)۔ بخاری ج ۲ ص ۸۸۹ کتاب الادب (٤)۔ ابوداؤد ج ۲ ص ۱۵ کتاب الخراج والامارہ

دوسرے موقع پر فرمایا:

انما انا قاسم واللہ یعطی ۔ میں تو صرف بانٹنے والا ہوں دینے والا تو خدا ہے۔

غنیمت کا مال بھی مجاہدوں ہی کو دے دیا جاتا تھا اور حضور ﷺ کو صرف ایک خمس یعنی پانچویں حصے پر تصرف کا اختیار ہوتا تھا' اس تصرف کے معنی یہ ہیں کہ اس حصہ سے حضور ﷺ اپنے اہل بیت کے علاوہ ان نادار محتاج مسلمانوں کو دیا کرتے تھے جن کو جنگ کے قواعد کے رو سے مال غنیمت سے کچھ نہیں مل سکتا تھا' اسی طرح لڑائی کے بغیر جو علاقہ اسلام کے تصرف میں آتا تھا وہ حضور ﷺ کے تصرف میں گو براہ راست دے دیا جاتا تھا لیکن اس تصرف کا مقصد بھی یہی ہوتا تھا کہ حضور ﷺ اس کی آمدنی اپنی صوابدید سے اپنی خانگی ضروریات میں صرف فرمانے کے بعد اسلام کی ضروریات ہی میں صرف فرماتے تھے اور اعلان فرما دیا تھا کہ یہ مسلمانوں کی ضروریات ہی میں صرف ہوگی۔

صحابہ میں سے جو لوگ ایران و روم کے ظاہری جاہ و جلال اور چمک دمک دیکھ چکے تھے ان کو بھی یہ مغالطہ تھا کہ اسلام کے ظاہری رعب و وقار کے لیئے ظاہری شاہانہ تزک و احتشام اور شان و شوکت بھی ضروری ہے' چنانچہ انہیں بار بار یہ خیال ہوتا تھا کہ آنحضرت ﷺ سادگی و تواضع اور زہد و قناعت کے بجائے کاش ایسی ہی عیش و آرام کی زندگی بسر فرماتے جیسی روم کے قیصر اور ایران کے شہنشاہ بسر کرتے ہیں۔

ایک بار حضرت عمر رضی اللہ عنہ آپ ؐ کے اس حجرہ میں حاضر ہوئے جہاں آپ ؐ کی ضرورت کی چیزیں رہتی تھیں' دیکھا تو آپ ؐ ایک چمڑے کے تکیہ سے جس میں کھجور کے پتے اور چھال بھری ہوئی تھی' ٹیک لگائے ایک کھری چٹائی پر لیٹے ہوئے ہیں

اور جسم مبارک پر چٹائی کے نشان پڑ گئے ہیں' حجرہ میں ادھر ادھر نگاہ دوڑائی لیکن تین سوکھے چمڑوں کے سوا کوئی دوسرا اثاث البیت نظر نہ آیا' ایک طرف مٹھی بھر جو رکھے تھے' اس منظر سے حضرت عمرؓ سخت متاثر ہوئے اور ان کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں' حضور ﷺ نے رونے کا سبب پوچھا' عرض کی: اے اللہ کے نبی! میں کیوں نہ روؤں' جب میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ (بستر نہ ہونے سے) چٹائی کے نشانات پشت مبارک پر پڑ گئے ہیں اور آپ ﷺ کا سارا اثاث البیت میرے سامنے ہے ادھر قیصر و کسریٰ ہیں جو باغ و بہار اور عیش و آرام کے مزے لوٹ رہے ہیں' اور حضور اللہ کے رسول ہیں اور ان سے بے نیاز ہیں' ارشاد ہوا کہ اے ابن خطاب! کیا تمہیں یہ پسند نہیں کہ ہم آخرت لیں اور وہ دنیا؟ حضرت عمرؓ نے عرض کی کہ ہاں! بے شک یا رسول اللہ! دوسری روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے عرض کی: یا رسول اللہ! دعا فرمایئے کہ خدا آپ ؐ کی امت کو فارغ البال کرے' کیونکہ رومی اور ایرانی باوجود یہ کہ خدا کی پرستش نہیں کرتے لیکن خدا نے ان کو تمام دنیوی ساز و سامان دیئے ہیں' آپ ؐ دفعتاً اٹھ بیٹھے اور فرمایا: ''کیوں ابن خطاب تم اس خیال میں ہو کہ رومی اور ایرانی تو وہ قوم ہیں کہ ان کو تمام لذائذ دنیا ہی میں دے دیئے گئے ہیں۔''(۱)۔

اس تقریر دل پذیر کی تاثیر دیکھیے کہ وہی حضرت عمرؓ جو حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیئے تزک و احتشام اور عیش و آرام کی زندگی کی آرزو ظاہر کر رہے تھے' جب ان کی خلافت کا وقت آیا تو وہ بھی گودڑی اور مرقع (۲)۔ ہی پہن کر اور جھونپڑے میں بیٹھ کر سونے چاندی اور زر و جواہر والے روم کے قیصر اور ایران کے کسریٰ پر حکمرانی کر رہے تھے اور ہر میدان میں ان کو شکست دے رہے تھے۔

---

(۱)۔ بخاری و مسلم' کتاب النکاح' باب الایلا (۲)۔ یعنی پیوند دار کپڑا (معارف)

---

قیسؓ بن سعد ایک صحابی تھے' وہ حیرہ گئے اور وہاں دیکھا کہ لوگ وہاں کے مرزبان (رئیس) کے آگے سجدہ کرتے ہیں' ان پر اس کا خاص اثر ہوا اور انہوں نے دل میں

کہا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سجدہ کے سب سے زیادہ مستحق ہیں، چنانچہ وہ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنا خیال ظاہر کیا، آپ ﷺ نے فرمایا: ایسا ہرگز نہ کرنا، اگر میں بالفرض کسی کو سجدہ کی اجازت دیتا تو بیویوں کو دیتا کہ وہ اپنے شوہروں کو سجدہ کریں۔ (۱)۔ دوسری روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے ان سے پوچھا کہ کیا اگر تم میری قبر پر گزروگے تو سجدہ کروگے؟ عرض کی نہیں، تو فرمایا کہ تو پھر اب بھی نہیں کرنا چاہئے۔ (۲)۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت معاذؓ صحابی ایک دفعہ شام سے واپس آئے تو حضور ﷺ کو سجدہ کیا آپ ﷺ نے حیرت سے فرمایا: معاذ کیا؟ عرض کی: یارسول اللہ میں نے رومیوں کو دیکھا کہ وہ اپنے پیشواؤں اور افسروں کو سجدہ کرتے ہیں تو دل چاہا کہ میں بھی حضور ﷺ کو سجدہ کروں، ارشاد ہوا کہ خدا کے سوا کسی اور کو میں سجدہ کرنے کو کہتا تو بیویوں کو کہتا کہ وہ اپنے شوہروں کو سجدہ کریں۔ (۳)۔

ان تمام واقعات میں صاف نظر آتا ہے کہ اہل عرب خود اس کے خوگر تھے کہ وہ اپنے بادشاہوں اور پیشواؤں کو اپنے قرب و جوار کے سلاطین کی طرح عیش و آرام اور تزک و احتشام کے ساتھ دیکھیں، مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی تعلیم، اپنے تزکیہ اور اپنے فیض اثر اور اپنے نمونہ سے دکھایا کہ یہ استکبار و ترفع اور اسراف و تبذیر کی زندگی خدا کو محبوب نہیں اور اسلامی تعلیم کی نظر میں مرغوب نہیں، حیات دنیا کی یہ زینت و رونق سراب کی نمائش اور حباب کی سربلندی سے زائد نہیں، اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اس حقیقت کو بار بار ظاہر فرمایا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کا کامل نمونہ بن کر دکھا دیا، اور آپ ﷺ کے بعد آپ ﷺ کے خلفاء راشدین اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے بھی اس کی پیروی کی، اور یہی سادگی و تواضع اسلام کا شعار قرار پایا۔

عام سلطنتوں میں محاصل کی عطا و بخشش شاہانہ تقرب اور عیش پسند امراء کے موروثی

استحقاق اور سعی و سفارش کی بنا پر ہوتی تھی، جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ دولتمند کی دولت مندی اور فقراء کی محتاجی میں اضافہ ہوتا جاتا تھا، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے احکام الٰہی کے تحت جو اسلامی نظام قائم فرمایا اس میں دولتمند اور تقرب نہیں، بلکہ حاجت اور ضرورت کو معیار قرار دیا گیا، کیونکہ ضعفاء کا حق اقویاء کے مقابلہ میں زیادہ توجہ کے قابل تھا، عرب میں لونڈیوں اور غلاموں کا کوئی حق نہیں تھا، لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حقوق میں ان کو بھی آزاد لوگوں کے ساتھ حصہ دیا، ابوداؤد میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس ایک تھیلی لائی گئی جس میں کچھ یمنی مہریں تھیں، آپ ﷺ نے ان کو لونڈیوں اور آزاد عورتوں پر تقسیم کر دیا، وظیفے جب تقسیم ہوتے تو آزاد شدہ غلاموں کو سب سے پہلے ان کا حصہ دیا جاتا۔ (۴)۔

(۱)۔ابو دائود و کتاب النکاح۔ (۲)۔ (۳)۔ ابن ماجہ کتاب النکاح۔ (۴)۔ یہ دونوں واقعے ابوداؤد کتاب الخراج میں ہیں۔

سلاطین کی بارگاہ میں بے اجازت لب کشائی بھی جرم تھی، اور اجازت بھی ہوتی تو تکلفات وتصنعات اور غلامی وعبودیت کے اظہار کے مختلف اسلوبوں کے بعد کہیں حرف مدعا زبان پر آتا تھا، اسلام کے نظام حکومت کا یہ حال تھا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت وجلالت اگرچہ صحابہؓ کو بارگاہ نبوت میں ایک طائر بے جان بنا دیتی تھی، تاہم ہر شخص کو عام اجازت تھی کہ بے تکلف عرض مدعا کرے، ناآشنا بدو آتا تو یا محمدؐ کہہ کر خطاب کرتا اور حضورؐ خوش دلی کے ساتھ جواب دیتے، اور مسلمان یا رسول اللہ کہہ کر مطلب کو شروع کرتا تھا، آپؐ کے احکام کی تعمیل ہر مسلمان کا ایمان تھا، مگر جب اس کو یہ معلوم ہوتا کہ حضورؐ کا یہ حکم بطور مشورہ ہے تو بے تکلف اپنا خیال ظاہر کر دیتا تھا اور حضورؐ اس کو شفقت سے سنتے تھے اور اس کے قبول پر اس کو مجبور نہ فرماتے۔

اسلام کا قانون ہے کہ اگر کسی لونڈی کا نکاح اس کے مالک نے کسی غلام سے کر دیا تو

آزادی کے بعد اس عورت کو حق ہے کہ چاہے اس نکاح کو برقرار رکھے یا توڑ دے' حضرت بریرہؓ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ کی ایک لونڈی تھیں' وہ جب آزاد ہوئیں تو انہوں نے اپنے شوہر سے علیحدگی اختیار کر لی' ان کے شوہر اس غم میں روتے تھے آخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت بریرہؓ سے فرمایا کہ تم ان کو اپنی شوہری میں لے لیتیں تو اچھا تھا' انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ! یہ آپ ﷺ کا حکم ہے؟ ارشاد ہوا کہ نہیں! سفارش ہے' عرض کی تو قبول سے معذور ہوں' آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس پر ان سے کوئی مواخذہ نہیں فرمایا۔ (۱)۔

غزوۂ بدر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مقام پر قیام فرمایا' فن جنگ کے بعض ماہر صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ! آپ ﷺ اس مقام کا انتخاب وحی سے فرمایا ہے' یا اپنی رائے سے؟ فرمایا: رائے سے' انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ! جنگی نقطۂ نظر سے یہ مقام مناسب نہیں ہے بلکہ ہم کو بدر کے کنوئیں کے پاس آگے بڑھ کر ٹھہرنا چاہئے' چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بے تامل ان کی رائے پر عمل فرمایا اسی قسم کے تجربی امور کے متعلق آپ کا ارشاد ہے کہ:

انتم اعلم بامور دنیاکم۔ تم اپنے دنیاوی معاملات میں جن کا تعلق تجربات سے ہو تم زیادہ واقف ہو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے تو یہاں لوگوں کو دیکھا کہ نر و مادہ کھجور کے درختوں میں پیوند لگاتے ہیں' آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ دیکھا تو خیال فرمایا کہ یہ ایسا ٹوٹکے کے لیئے کرتے ہوں گے' اس لیئے مشورہ دیا کہ تم یہ نہ کرتے تو اچھا تھا' چنانچہ انصار نے اس پر عمل کیا' نتیجہ یہ ہوا کہ کھجوریں بہت کم اور خراب پیدا ہوئیں' آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ادھر سے گزر ہوا تو دریافت فرمایا' انہوں نے صورت حال عرض کی تو ارشاد ہوا کہ میں نے اپنے گمان سے یہ بات کہی تھی' تم اپنے دنیا کے کاموں کو اچھا جانتے ہو' ان تمام امور میں جن کا تعلق

وحی سے ہے‘ میری اتباع ضروری ہے‘ لیکن دنیاوی کاموں میں جن میں اپنی رائے سے کچھ کہتا ہوں تو میں بھی بشر ہوں تم آزاد ہو۔ (۲)۔

(۱)۔ صحیح بخاری‘ باب تکون الحرہ تحت العبد وباب شفاعۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی زوج بریرہؓ۔ اگر اس لونڈی کا شوہر غلام ہو تو بالاتفاق بھی حکم ہے‘ اگر آزاد ہو تو اس میں فقہا کا اختلاف ہے۔ (۲)۔ صحیح مسلم باب الفضائل۔

ان امور کے باب میں جن کا تعلق دنیاوی معاملات کے تجربوں سے ہے‘ یہ حدیث بڑی اہمیت رکھتی ہے لیکن جن امور میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بالوحی ہوتا تھا اور وہ گویا مصلحت خداوندی پر مبنی ہوتا‘ ہے جس کی اطلاع حضورﷺ کو بذریعہ وحی ہوتی تو ان میں پھر کسی کا مشورہ توجہ کے قابل نہیں ہو سکتا تھا‘ کیونکہ ان کا منشا حکم الٰہی ہوتا تھا جس کا ماننا ہی ضروری ہے اس میں بندہ کو دخل نہیں۔

غزوہ حدیبیہ میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہایت نرم شرائط پر صلح کر لی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ذاتی طور پر محسوس ہوا کہ یہ صلح دب کر کی گئی ہے اس لیئے وہ جوش اسلام سے بے تاب ہو گئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آ کر عرض کی کہ یا رسول اللہ! آپ کیا پیغمبر برحق نہیں ہیں؟ آپﷺ نے فرمایا: بے شبہہ ہوں‘ انہوں نے کہا کیا ہم حق پر اور ہمارے دشمن باطل پر نہیں ہیں؟ آپﷺ نے فرمایا کہ میں خدا کا پیغمبر ہوں اور اس کی نافرمانی نہیں کرتا‘ وہ میری مدد کرے گا‘ انہوں نے کہا کہ کیا آپﷺ نے ہم سے نہیں کہا تھا کہ ہم چل کر خانہ کعبہ کا طواف کریں گے؟ آپﷺ نے فرمایا: کہ ہاں! لیکن حضرت عمرؓ کو اس سوال و جواب سے بھی تسکین نہیں ہوئی تو حضرت ابو بکرؓ کے پاس آئے اور یہی گفتگو کی‘ انہوں نے بھی وہی جواب دیئے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیئے تھے‘ آخر میں جب اصل حقیقت ان کو سمجھ میں آ گئی تو انہوں نے خود اپنی اس عرض و معروض کو گستاخی خیال کیا اور اس کے کفارہ میں صدقہ دیا‘ روزے رکھے اور غلام

آزاد کیا' (۱)۔ اس واقعہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ حضرت عمرؓ نے گو بہت کچھ عرض ومعروض کی' مگر حضور ﷺ نے اپنے فیصلے کو نہیں بدلا' کیونکہ یہ فیصلہ ارادت ربانی سے کیا گیا تھا۔

اس طرح اسی واقعہ حدیبیہ میں جب شرائط صلح طے ہو جانے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے احرام کھول دینے کا مشورہ مسلمانوں کو دیا' تو چونکہ ان کے شدت شوق زیارت کعبہ کے خلاف یہ صورت پیش آئی اس لیئے ان کو حزن وملال ہوا اور اسکے سبب سے مسلمانوں نے تعمیل ارشاد میں تساہل برتا جس سے ان کی غرض یہ تھی کہ حضور ﷺ یہ دیکھ کر غلاموں پر شفقت فرمائیں گے اور ان کی تمنا کے مطابق اپنی رائے کو بدل دیں گے لیکن جب آپ نے یہ دیکھا کہ لوگ رائے پر اڑے ہیں اور ان کا اس پر اصرار مصلحت ربانی کے خلاف ہے تو یہ امر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر شاق گزرا اور مغموم ہو کر ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لے گئے ام المومنین نے چہرہ مبارک پر آزردگی کا اثر پا کر سبب دریافت کیا' آپ نے واقعہ بیان فرمایا' حضرت ام سلمہ نے مشورہ کے طور پر عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپ کسی سے کچھ نہ فرمائیں' آپ خود اپنا احرام کھول دیں چنانچہ آپ نے ایسا ہی کیا' شمع نبوت کے پروانوں (صحابہؓ) نے یہ دیکھ کر سمجھ لیا کہ اب حضور اپنے فیصلہ کو تبدیل نہیں فرمائیں گے' پھر تو یہ عالم ہوا کہ احرام کھولنے اور سر کے بال منڈوانے کے لیئے لوگ ایک دوسرے پر ٹوٹے پڑتے تھے۔

(۱)۔ بخاری ج ۱ ص ۳۸۰' کتاب الشروط۔

اس واقعہ میں دونوں قسم کی مثالیں موجود ہیں' حدیبیہ کا فیصلہ چونکہ امر الٰہی سے تھا اس میں کسی کے مشورہ کی کوئی پرواہ نہیں فرمائی اور احرام کھلوانے کی تدبیر جو ام المومنین حضرت ام سلمہؓ نے عرض کی وہ ایک انسانی تدبیر تھی جس کا تعلق علم النفس اور امور تجربیہ سے تھا' اس لیئے اس پر بلا تامل عمل فرمایا۔ (۱)۔

بعض ایسے واقعات بھی پیش آئے ہیں جن میں لوگ اپنی کم فہمی، ناعاقبت اندیشی یا اپنی بشری کمزوری کے سبب غصہ میں حضور ﷺ پر اعتراض کر بیٹھے، لیکن حضور ﷺ نے اس پر تحمل فرمایا اور معترض کو اس کی گستاخی کی کوئی سزا نہیں دی۔

ایک دفعہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اور ایک انصاری صحابی میں آبپاشی کے متعلق نزاع ہوئی، صورت یہ تھی کہ پہلے حضرت زبیرؓ کا کھیت پڑتا تھا اور اس کے بعد ان انصاری کا، انصاری چاہتے تھے کہ وہ پہلے پانی لیں، اور حضرت زبیرؓ چاہتے تھے کہ وہ ان کو نہ لینے دیں، آخر معاملہ آنحضرت ﷺ تک پہنچا، قانون اسلام کا تقاضا یہ تھا کہ جو زمین کنوئیں سے قریب تر ہے اسی کو پانی لینے کا حق ہے، دور کے کھیت والے کو یہ حق نہیں کہ وہ بلا اجازت قریب کے کھیت کو کاٹ کر اپنے کھیت میں پانی لے جائے، لیکن آپ ؐ نے حضرت زبیرؓ سے فرمایا کہ تم پہلے آبپاشی کر لو، پھر پانی کو اپنے پڑوسی کے کھیت میں جانے دو، یہ ایک اخلاقی اور منصفانہ فیصلہ تھا، لیکن اس فیصلہ پر تقاضائے بشری سے وہ انصاری سخت برہم ہو گئے اور کہا کہ یا رسول اللہ آپ ؐ نے یہ فیصلہ صرف اس بنا پر کیا ہے کہ زبیر آپ ؐ کے پھوپھی زاد بھائی ہیں، یہ سن کر آپ ؐ کے چہرے کا رنگ بدل گیا، تب آپ ؐ نے اخلاقی فیصلے کے بجائے قانونی فیصلہ دیا، اور حضرت زبیرؓ سے فرمایا کہ زبیر! آبپاشی کر کے پانی روک لیں یہاں تک کہ کھیت کی مینڈ تک پہنچ جائے۔ (۱)۔ یعنی پانی بہہ کر مینڈ کے اوپر سے دوسرے کھیتوں میں از خود چلا جائے، یوں نہ جائے۔

ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مال غنیمت کی تقسیم فرما رہے تھے، قبیلہ بنو تمیم کا ایک شخص جس کا نام ذوالخویصرہ تھا، آیا اور کہا کہ یا رسول اللہ! انصاف فرمائیے! آپ ﷺ نے فرمایا اگر میں انصاف نہ کروں گا تو کون کرے گا؟ ذوالخویصرہ کی اس گستاخی پر حضرت عمر رضی اللہ عنہا، کو غصہ آ گیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا: اگر آپ اجازت دیجئے تو اس کی گردن اڑا دوں، لیکن آپ ﷺ نے ان کو

کے حق سے زیادہ دلوادیا۔(۳)۔

(۱)۔صحیح مسلم ج ۲ ص ۳٦٦' کتاب الزکوٰۃ باب ارضاء السعاۃ۔
(۲)۔ سنن ابی دائود' کتاب الادب' باب العلم۔ (۳)۔ ابن ماجہ لصاحب الحق سلطان۔

ایک دفعہ ایک بدو اونٹ کا گوشت بیچ رہا تھا' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خیال یہ تھا کہ گھر میں چھوہارے موجود ہیں' آپ نے ایک وسق چھوہاروں پر گوشت چکالیا' گھر میں آ کر دیکھا تو چھوہارے نہ تھے باہر تشریف لا کر قصاب سے فرمایا کہ میں نے چھوہاروں پر گوشت چکایا تھا' لیکن چھوہارے میرے پاس نہیں ہیں' اس نے واویلا مچایا کہ ہائے بدمعاملگی' لوگوں نے سمجھایا کہ رسول اللہ بدمعاملگی کریں گے؟ آپ نے فرمایا نہیں' اس کو چھوڑ دو اس کو کہنے کا حق ہے' پھر قصاب کی طرف خطاب کر کے وہی فقرہ ادا کیا' اس نے پھر وہی لفظ کہے' لوگوں نے پھر روکا' آپ نے پھر فرمایا: اس کو کہنے دو' اس کو کہنے کا حق ہے اور اس جملہ کو کئی بار بار دہراتے رہے۔اس کے بعد آپ نے ایک انصاریہ کے ہاں اس کو بھجوادیا کہ اپنے دام کے چھوہارے وہاں سے لے لے' جب وہ چھوہارے لے کر پلٹا تو آپ ﷺ صحابہ کے ساتھ تشریف فرما تھے اس کا دل آپ ﷺ کے حلم وعفو اور حسن معاملہ سے متاثر تھا' دیکھنے کے ساتھ بولا: ''محمد تم کو خدا جزائے خیر دے' تم نے قیمت پوری دی اور اچھی دی۔''(۱)۔

بہر حال یہ تو مسلمانوں کے ساتھ کے معاملے تھے' ان سے بڑھ کر وہ واقعات ہیں جو یہودیوں کی بے جا و ناروا یہودگیوں کے مقابلہ میں پیش آئے' جن کی حیثیت ایک ذمی رعایا کی ہو چکی تھی۔

زید بن سعنہ جس زمانہ میں یہودی تھے لین دین کا کاروبار کرتے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے کچھ قرض لیا' میعاد ادائی میں ابھی کچھ دن باقی تھے کہ تقاضے کو آئے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چادر پکڑ کر کھینچی اور سخت وسست کہہ کر کہا

کہ ''اے عبدالمطلب کے خاندان والو تم ہمیشہ یوں ہی حیلے حوالے کیا کرتے ہو۔''
حضرت عمرؓ غصہ سے بیتاب ہو گئے' اس کی طرف منہ کر کے کہا: او خدا کے دشمن! تو رسول اللہ ﷺ کی شان میں گستاخی کرتا ہے؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسکرا کر کہا: عمر: مجھ کو تم سے اور کچھ امید تھی' اس کو سمجھانا چاہئے کہ وہ نرمی سے تقاضا کرے' اور مجھ سے کہنا چاہئے تھا کہ میں اس کا قرض ادا کروں یہ فرما کر حضرت عمرؓ ہی کو ارشاد ہوا کہ جاؤ اس کا قرضہ ادا کر کے اس کو بیس صاع کھجور کے اور زیادہ دے دو' یہودی حلم وعفو کے اس پر اثر منظر کو دیکھ کر مسلمان ہو گیا۔ (۲)۔

ایک دفعہ آپؐ کے پاس صرف ایک جوڑا کپڑا رہ گیا' اور وہ بھی موٹا اور گندا تھا' پسینہ آتا تو اور بھی بوجھل ہو جاتا' اتفاق سے ایک یہودی کے یہاں شام سے کپڑے آئے' حضرت عائشہؓ نے عرض کی کہ ایک جوڑا اس سے قرض منگوا لیجئے' آنحضرت ﷺ نے یہودی کے پاس آدمی بھیجا' اس گستاخ نے کہا: میں سمجھا' مطلب یہ ہے کہ میرا مال یونہی اڑا لیں اور دام نہ دیں' آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ ناگوار جملے سن کر صرف اس قدر فرمایا کہ وہ خوب جانتا ہے کہ میں سب سے زیادہ محتاط اور سب سے زیادہ امانت کا ادا کرنے والا ہوں۔ (۳)۔

ان واقعات کے ذکر سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم' جو پیغمبر ہونے کے علاوہ ایک امیر کی حیثیت بھی رکھتے تھے' لوگوں نے اس حیثیت سے آپ ﷺ پر جو سخت سے سخت اعتراض کیا' آپ ﷺ نے اس کو کس حلم اور عفو سے سنا' اور معاملہ کا فیصلہ کیا' یا واقعہ کی تفصیل فرما کر لوگوں کی تسلی کر دی' ذرا اسلام کے امیر کو زمانہ کے سلاطین اور امراء کے غرور وتکبر سے ملایئے جو رعایا کی ذرا ذرا سی بے ادبی اور گستاخی پر ان کو سخت سے سخت عبرتناک سزائیں دیتے ہیں اور ان کا قانون اس کو جائز قرار دیتا ہے' بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ ان کے قانون کی سب سے پہلی دفعہ یہی ہے کہ ذات شاہانہ ہر مواخذہ سے بری اور ہر دار وگیر سے برتر ہے اس

سے بھلا برا جو کچھ ہو وہ قانون کی گرفت سے باہر ہے لیکن اسلام کے قانون کے نظر میں امیر و مامور، حاکم و محکوم اور راعی و رعیت قانون کی دار و گیر اور سزا اور مواخذہ میں بالکل یکساں ہیں۔

(۱)۔مسند احمد بن حنبل ج ٦ ص ٢٦٨۔ (٢)۔ یہ روایت بیہقی و ابن حبان، طبرانی اور ابونعیم نے روایت کی ہے اور سیوطی نے کہا ہے کہ اس کی سند صحیح ہے (شرح شفاء از شہاب خفاجی)۔ (٣)۔ جامع ترمذی، کتاب البیوع۔

یہاں یہ نکتہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم معصوم تھے جن کا ہر قول و فعل جائز حدود سے کبھی باہر نہیں ہو سکتا تھا بلکہ تمام تر مستحسن ہی ہوتا تھا، اور آپ ﷺ کی خدمت اقدس میں ذرا سی گستاخی بھی ایمان سے محروم کر کے واصل جہنم کر سکتی تھی، با ایں ہمہ آپ ﷺ کے ذاتی کاروبار اور حکومت کے معاملات کی نسبت سوال و جواب اور استفسار کی جرأت کو جائز رکھا جانا صرف اس لیئے تھا کہ آپ ﷺ کا یہ اسوہ آئندہ امرائے اسلام کی تعلیم کے لیئے عملی سبق ہو اور اس کے لیئے غایت شفقت سے خود زحمت برداشت فرماتے تھے، تا کہ آئندہ والے امراء اور احکام استفسار و اظہار رائے کے دروازے کو امت پر بند نہ کریں۔

عہد نبوت میں جو متمدن سلطنتیں تھیں، ان میں ایران نے کبھی ذات شاہانہ پر اس رو در و سوال و جواب استفسار اور اعتراض کا خواب بھی نہیں دیکھا تھا، لیکن وہ جمہوری سلطنتیں درحقیقت امراء کی تھیں، ان کا تعلق عوام سے نہ تھا اور نہ ان کو امراء کے مقابلے میں یہ حق سوال و مواخذہ حاصل تھا اور نہ ان کے امراء و حکام میں اس تواضع، اس خاکساری، اس عفو حلم، اس انصاف اور اخلاق کی بلندی کا یہ منظر نظر آیا، اور نہ آ سکتا تھا، وہ اخلاص قلب و صداقت اور پاکیزگی اخلاق کے اس بلند نصب العین کی گود کو بھی نہیں پہنچ سکتے تھے، زیادہ سے زیادہ یہ کہ وطن ان کا دیوتا تھا اور وہ اس کے پجاری تھے اور وہ اس دیوتا کے لیئے سب کچھ کر سکتے تھے اور ان کا وطن چہار دیواری

میں محدود تھا' جس کے باہر گویا انسان نہیں بستے تھے' اسلام پہلا مذہب ہے جس نے امیر کی قانونی حیثیت کی یکسانی کی وہ نظیر پیش کی جس سے دنیا ہنوز نا آشنا تھی اس حقیقت پر ایک اور پہلو سے بھی غور کیجئے کہ یہ نفس امیر سے سوال و استفسار کی صورت نہیں ہے' بلکہ اس ذات اقدس ﷺ سے ہے' جس کی خاک عقیدت مسلمانوں کے چشم ادب کا سرمہ تھی اور جس کی حیثیت محض ایک امیر اور حاکم کی نہ تھی بلکہ اس سے بدرجہا بڑھ کر ایک معصوم رسول اور ایک پاک نبی کی تھی صلوت اللہ تعالیٰ علیہ۔

اس کے بعد سلطنت و امارات اور حکومت کے کاروبار میں اہل رائے مسلمانوں سے مشورہ لینے کا معاملہ ہے ظاہر ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے باب میں مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ وحی سے قطع نظر کر کے بھی آپ عقل و دانش اور علم و فہم میں تمام لوگوں سے اعلیٰ اور برتر تھے اور ظاہر ہے کہ جو شخص عقل و فہم اور علم و دانش کے اس رتبہ پر ہو اس کو اپنے سے کم تر لوگوں سے معاملات میں مشورہ لینے کی ضرورت نہ تھی لیکن آپ ﷺ مشورہ کرتے تھے' ایک تو اس لیئے کہ ان سے رائے لینے میں ان کا دل بڑھے اور دوسرے اس لیئے کہ چونکہ آپ ﷺ کا ہر فعل اسلام کی شریعت کا قانون بن جاتا ہے' اس لیئے آپ ﷺ کا یہ فعل یعنی مشورہ کرنا بعد کے آنے والے خلفاء و امراء کے لیئے مثال و نظیر کا کام دے' آپ ﷺ کو یہ حکم الٰہی ہوا کہ:

وشاورهم في الامر۔ (آل عمران ع:۱۷)

اے رسول ﷺ! امور سلطنت و جنگ و صلح میں اپنے رفیقوں سے مشورہ لے لیا کیجئے۔

چنانچہ حضور نے اس پر بہ نفس نفیس عمل فرمایا اور مسلمانوں کو بھی عمل فرمانے کی ہدایت فرمائی' انہوں نے عمل کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی مدد فرمائی اور ان کی خصوصیت ظاہر کی کہ:

وامرهم شورى بينهم۔ (شوریٰ:۴)

## ان (مسلمانوں) کے معاملات باہمی مشورہ سے انجام پاتے ہیں

اگر چہ عہد نبوت میں حکومت کے سارے اجزا وجود پذیر نہیں ہوئے تھے اور نہ چنداں ان کی ضرورت تھی تاہم احادیث کے تتبع و استقراء سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکومت سے متعلق متعدد اہم امور کے متعلق صحابہؓ سے مشورہ فرمایا' اور ان کی رایوں پر عمل کیا' اور اس کا منشا صرف یہی ہوسکتا ہے کہ عام مسلمانوں کو معلوم ہو جائے کہ اس قسم کے انتظامی امور میں باہم مشورہ کر لینا تا کہ مفید نتیجہ تک پہنچنے میں آسانی ہو' نہایت مناسب ہے' ورنہ ظاہر ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس کی چنداں حاجت نہ تھی۔(۱)۔

مدینہ پہنچ کر جب مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوا اور نماز باجماعت ادا ہونے لگی تو پہلا مرحلہ یہ پیش آیا کہ تمام لوگوں کو کیونکر ایک مسجد میں جمع کیا جائے' اس کے متعلق ہنوز وحی بھی نہیں آئی تھی اس لیئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ سے مشورہ فرمایا' یہود و نصاریٰ کے یہاں ایسے موقع پر بوق و ناقوس بجایا جاتا تھا بعض لوگوں نے اسی کا مشورہ دیا' بعض لوگوں نے نماز کا وقت ہونے پر علم بلند کرنے کی رائے دی' لیکن آپ ﷺ نے ان میں سے کسی رائے کو پسند نہیں فرمایا' آخر میں حضرت عمرؓ نے رائے دی کہ ایک آدمی کو بھیج کر نماز کا اعلان کرایا جائے تو آپؐ نے ان کی رائے کو پسند فرمایا اور حضرت بلالؓ کو حکم دیا' انہوں نے الصلوٰۃ جامعۃ کہہ کر پکارا' اس کے بعد ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو رویا میں اذان کی موجودہ صورت دکھائی گئی۔(۲)۔اور فیض تاثیر سے بعض دوسرے صحابہؓ نے بھی اسی قسم کا خواب دیکھا اور آ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بیان کیا' چنانچہ آپ ﷺ نے اسی طریقہ کے مطابق حضرت بلالؓ کو اذان دینے کا حکم دیا۔

---

(۱)۔مصنف عبدالرزاق و طبقات ابن سعد و کتاب المراسیل لابی دائود و فتح الباری ابن حجر و روض و الانف سہیلی و زرقانی علی

لمواهب و نووی شرح مسلم باب بدء الاذان' نووی میں ہے (فشرعه النبی صلی الله علیه وسلم بعد ذالك اما بوحی او باجتهاده صلی الله علیه وسلم علی مذهب الجمهور فی جوازا لاجتهاد له صلی الله علیه وسلم ولیس هو عملا بمجرد المنام هذا مالا یشك فیه بالاختلاف۔ (۲)۔ ابوداؤد و ترمذی' باب بدء الاذان۔

بدر کے موقع پر شہر سے باہر نکل کو یا میدان جنگ کے قریب پہنچ کر آپ ﷺ نے صحابہؓ سے مشورہ کیا کہ دشمن کا مقابلہ کیا جائے یا نہیں؟ باری باری سے ممتاز صحابہؓ نے اپنی اپنی رائے ظاہر کی' یہاں تک کہ ایک رئیس نے اٹھ کر کہا یا رسول اللہ! ہم بنی اسرائیل کی طرح نہیں جو پیغمبر سے یہ کہہ دیں کہ تم اور تمہارا رب جا کر میدان جنگ میں دشمنوں سے لڑو ہم تو یہیں رہیں گے' خدا کی قسم' اگر آپ ﷺ سمندر میں بھی جانے کو فرمائیں گے تو ہم چلے جائیں گے اس کے بعد جب آپ ﷺ میدان جنگ کی طرف بڑھے تو ایک مقام پر جا کر پڑاؤ ڈالنا چاہا' ایک تجربہ کار صحابی نے آ کر عرض کی کہ یا رسول اللہ! آپ حسب فرمان الٰہی اس مقام پر لشکر کا پڑاؤ ڈالنا چاہتے ہیں یا حضور کی یہ اپنی رائے ہے؟ ارشاد ہوا کہ یہ میری رائے ہے' اس پر انہوں نے عرض کی کہ یا رسول اللہ! ہم کو بدر کے ایسے مقام پر پڑاؤ ڈالنا چاہئے تا کہ پانی اپنے قبضہ میں رہے' آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس رائے کو پسند فرمایا اور وہیں جا کر قیام فرمایا:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جب بدر کے قیدی پیش کیے گئے تو آپ ﷺ نے پھر تمام صحابہؓ سے مشورہ کیا کہ ان کے ساتھ کون سا طرز عمل اختیار کیا جائے' لوگوں نے مختلف رائیں دیں' آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کی رائے کے مطابق فدیہ لے کر ان کو رہا کر دیا۔(۱)۔

احد کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا صحابہؓ سے مشورہ چاہنا کہ ہم شہر سے باہر نکل کر حملہ آوروں کا مقابلہ کریں یا شہر کے اندر رہ کر ان کا دفاع کریں' اس پر عبداللہ بن ابی بن سلول منافق مدینہ کا رائے دینا کہ شہر کی گلی کوچوں میں رہ کر

مقابلہ کیا جائے' پھر پر جوش جاں نثار صحابہؓ کا عرض کرنا کہ حضور شہر کے باہر نکل کر ہم کو لڑنا چاہئے اور حضورؐ کی رائے کے مطابق شہر سے باہر نکل کر حملہ آوروں کا مقابلہ کرنا امور حکومت میں مشورہ کی بہترین مثال ہے۔

غزوہ حنین میں جب قبیلہ ہوازن کا وفد آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور درخواست کی کہ ہمارا جو مال غنیمت میں آپ ﷺ کے پاس آیا ہے واپس کر دیا جائے' آپ ﷺ نے فرمایا کہ قیدی اور مال دونوں واپس نہیں مل سکتے' ان میں سے ایک کو انتخاب کرنا ہوگا' ان لوگوں نے قیدیوں کو انتخاب کیا' اور آپ ﷺ نے ان کی درخواست قبول کر لی اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم سے کسی کو سرتابی کی جرأت نہیں ہو سکتی تھی' پھر بھی آپ ﷺ نے تمام صحابہ کو جمع کر کے ایک خطبہ دیا جس میں فرمایا کہ تمہارے یہ بھائی کفر سے تائب ہو کر آئے ہیں' اور میری ذاتی رائے یہ ہے کہ ان کے قیدیوں کو واپس کر دوں اب تم میں جس کے دل میں جو آئے وہ کرے' جس کو مجھ سے اتفاق ہو وہ میری رائے پر عمل کرے اور جن لوگوں کو میری رائے سے اتفاق نہ ہو' وہ اس وقت قیدیوں کو آزاد کر دیں' جس وقت پہلا مال غنیمت آئے گا' ان کو اس کا معاوضہ دے دیا جائے گا' تمام لوگ یک زبان ہو کر بول اٹھے کہ یا رسول اللہ! ہم اس پر راضی ہیں۔ آپ ﷺ نے ان کے اس عاجلانہ اظہار رائے کو کافی نہیں سمجھا' فرمایا کہ ہر شخص کی رائے معلوم ہونا ضروری ہے کہ کون راضی ہے' اور کون راضی نہیں ہے؟ اس لیئے ہر شخص کو اپنا ایک قائم مقام وعریف ہمارے پاس بھیجنا چاہئے' چنانچہ ان قائم مقاموں نے تمام لوگوں سے گفتگو کر کے آپ ﷺ کو ان کی رضامندی کی اطلاع دی۔ (۲)۔

احادیث کی کتابوں کا استقصاء کیا جائے تو اور بھی متعدد مثالیں مل سکتی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے عہد مبارک میں حکومت کے انتظامی امور میں صحابہؓ سے مشورہ لیتے تھے اور ان کے مشوروں کو اگر پسند فرماتے تو

اندر اپنی فوج سرحد کے قریب لیے ہوئے اس تاک میں تھے کہ جیسے ہی مدت ختم ہو وہ رومیوں پر حملہ کر بیٹھیں' ایک نامی اور مشہور صحابی نے جو اس فوج میں شریک تھے فوراً ان کی اس حکمت عملی پر اعتراض کیا اور فرمایا کہ ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو بدعہدی قرار دیا ہے جس سے مسلمانوں کو باز رہنا چاہئے' یہ سن کر انہوں نے اپنی فوج ہٹالی۔(۳)۔

(۱)۔۱ (۲)۔ یہ حدیث اثر کے طور پر باختلاف لفظ بروایت ابوھریرہؓ ابن بخاری میں اور بروایت ابن عمر بیہقی اور حاکم میں اور بروایت ابوبکر صدیقؓ ابن ابی شیبہ میں ہے' یہ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم تک مرفوع نہیں' بظاہر ان حضرات صحابہ کے اقوال ہیں' تفصیل کے لیئے دیکھئے المقاصد الحسنہ سخاوی اور کشف الخفاء مزیل الالتباس عطاء حلبی لفظ سلطان' یہاں یہ یاد رکھنا چاہئے کہ قدیم عربی میں "السلطان" کے معنی بادشاہ کے نہیں' بلکہ طاقت و قوت کے ہیں' جو انگریزی لفظ "پاور" کے ہم معنی اور گورنمنٹ اور حکومت کے مترادف ہے' اس لیئے اس حدیث کے معنی یہ نہیں کہ بادشاہ زمین میں خدا کا سایہ ہے بلکہ یہ معنی ہیں کہ عمال حکومت پر بھی اس مناسبت سے کہ وہ حکومت کے نمائندے ہیں' سلطان کا اطلاق ہوتا ہے جیسے حدیث میں ہے۔ السلطان ولی من لا ولی لہ یعنی جس کا کوئی ولی نہ ہو اس کا ولی سلطان ہے' یہاں سلطان سے مقصود سلطنت ہے اس لیئے اس کا ہر جائز نمائندہ جیسے قاضی اور حاکم اور والی سلطان کہلائے گا' بادشاہ کے معنی ہیں یہ لفظ غالباً چوتھی صدی میں سلطان محمود کے زمانے سے بولا جانے لگا ہے۔ (۳)۔ صحیح بخاری' باب فضل من ترک الفواحش۔

ہر سلطنت کو ٹیکس' مال گزاری اور خراج کے وصل کرنے کے لیئے ہمیشہ سختی سے کام لینا پڑتا تھا' اور اگر حکام کی طرف سے ذرا سی سہل انگاری اور بے پروائی ظاہر ہو تو دفعتاً سلطنت کا خزانہ خالی ہو جاتا ہے' مجرم جب کسی عدالت کے سامنے پیش کیا جائے گا تو اس کو حکام کی غضب آلود نگاہوں میں رحم کی ایک شعاع بھی نظر نہ آئے گی' اور وہ اپنی بے گناہی ثابت کرنے کے لیئے ہر قسم کے خدع وفریب' مکر و حیلہ اور دروغ

بیانی سے کام لینا اپنا سب سے بڑا فرض خیال کرے گا' اس میں شخصی و جمہوری حکومتوں میں کوئی فرق نہیں ہے بلکہ دونوں ہی قسم کی سلطنتوں میں یہ نتائج یکساں طور پر ظہور پذیر ہوں گے' یورپ آج ظاہری و نمائشی تمدن و تہذیب میں بہت ترقی کر گیا ہے۔ تمام ملک میں تعلیم عام ہو گئی ہے' ہر فرد رموز سیاست سے واقف ہو گیا ہے اور سلطنت پر جمہور کا حق مسلم ہو گیا ہے لیکن با ایں ہمہ اگر سلطنت ذرا بھی سہل انگاری سے کام لے تو ایک فرد بھی محاصل سلطنت کو بخوشی ادا کرنے پر آمادہ نہ ہو گا' مجرموں کا بھی یہی حال ہے کہ وہ جرم کے ارتکاب کے بعد کبھی روپوش ہو جاتے ہیں' کبھی جرم کے پاداش سے بچنے کے لیئے ہزاروں' لاکھوں صرف کر دیتے ہیں' باوجود یہ کہ یورپ میں بہ نسبت اور جگہوں کے مجرموں کی حالت نہایت بہتر ہے اور سزا محض اخلاقی اصلاح کے لیئے دی جاتی ہے لیکن با ایں ہمہ کوئی یورپین اپنے جرائم کا صداقت سے اعتراف نہیں کرتا' بلکہ اس کی دروغ بیانی میں ندامت اور شرمندگی کی جگہ جرأت و دلیری کا عنصر غالب ہوتا ہے اور اس کو جمہوریت اور حریت کی ایک برکت خیال کیا جاتا ہے لیکن جب کسی سلطنت کا نظام اخلاقی اصول پر قائم ہوتا ہے تو اس کی حالت اس سے بالکل مختلف ہوتی ہے' ہر فرد سلطنت کے تمام احکام کو مذہبی پابندیوں کی طرح موجب عذاب و ثواب سمجھتا ہے اس لیئے ان پر بلا جبر و اکراہ عمل کرتا ہے اور یہ نتیجہ صرف اخلاق اور روحانیت ہی سے پیدا ہو سکتا ہے اسلام کا نظام سلطنت اسی اخلاقی اصول پر قائم تھا اور اس کا ویسا ہی نتیجہ ظاہر بھی ہوتا تھا' صدقہ و زکوٰۃ عرب کے لیئے ایک بالکل جدید چیز اور افلاس و غربت کی وجہ سے ان کا ادا کرنا ان کے لیئے مشکل تھا چنانچہ کعب بن اشرف کے قتل میں محمد بن مسلمہ نے اسلام کی جن مشکل باتوں کی بظاہر شکایت کی تھی ان میں ایک صدقہ و زکوٰۃ کی گراں باری بھی تھی' صدقہ اور زکوٰۃ کے وصول کرنے کے لیئے اگرچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد مبارک ہی میں عمال مقرر کر دیے گئے تھے تاہم اس کا کوئی باقاعدہ دفتر و

سر رشتہ او رنظام قائم نہیں ہوا تھا' ایسی حالت میں اگر عرب میں کوئی دنیوی سلطنت جمہوری اصول پر بھی قائم کر دی جاتی تو اس کو صدقہ وزکوٰۃ کے وصول کرنے میں غیر معمولی دشواریاں پیش آتیں' لیکن یہ اسلام کے نظام سلطنت کا اخلاقی اثر تھا کہ ہر فرد اور ہر قبیلہ خود اپنا صدقہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں لا کر پیش کرتا تھا اور اس کے صلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی برکت آمیز دعاؤں کی دولت لے کر واپس جاتا تھا' صحیح بخاری میں عبداللہ بن ابی اوفی سے روایت ہے:

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اذا اتاہ قوم بصدقتھم قال اللھم صلی علی ال فلان فاتاہ ابی بصدقتہ فقال اللھم صلی علی ال ابی اوفی (بخاری کتاب الزکوٰۃ ص:۲۰۳)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں جب کوئی قوم اپنا صدقہ لے کر حاضر ہوتی تھی تو آپ فرماتے تھے کہ خداوندا فلاں کی آل پر رحمت نازل فرما' چنانچہ میرے باپ بھی صدقہ لے کر آئے' تو آپ نے فرمایا کہ خداوندا! ابو اوفی کی آل پر رحمت بھیج۔

حضرت عدیؓ بن حتم قبیلہ طے کے سردار تھے اور ان کو تمام قوم کی طرف سے مرباع یعنی چوتھا ملتا تھا' جو عرب میں اسلام سے پہلے سرداران قریش کا خاص حق خیال کیا جاتا تھا لیکن جب وہ اسلام لائے تو سب سے پہلے انہی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں اپنے قبیلے کا صدقہ پیش کیا' صحیح مسلم میں روایت ہے کہ ایک بار وہ حضرت عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انہوں نے ان کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا:

ان اول صدقہت بیضت وجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و وجوہ اصحابہ صدقہ طی جئت بھا۔

## پہلا صدقہ جس کی مسرت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے صحابہ کا چہرہ چمک اٹھا' قبیلہ طے کا صدقہ تھا جس کو تم لے کر آئے تھے۔

قبیلہ بنو تمیم جب اپنا صدقہ لے کر آیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

صدقات قومنا۔ (۱)۔

یہ ہماری قوم کا صدقہ ہے۔

اشخاص کی حالت اس سے بھی زیادہ عجیب وغریب تھی۔ حضرت عبداللہؓ بن مسعود کا بیان ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صدقہ کا حکم دیا تو ہم لوگ بازاروں میں جا کر بوجھ ڈھوتے تھے اور اس سے جو مزدوری ملتی تھی اس کو لا کر صدقہ میں دیتے تھے۔ (۳)۔

جرائم کی یہ صورت تھی کہ گو وہ مٹ تو نہیں گئے تھے لیکن اس درجہ کم ہو گئے تھے کہ گویا نہ ہونے کے برابر تھے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ جو لوگ اتفاق سے ان کے مرتکب ہوتے تھے تو جرم کا نشہ ٹوٹنے کے ساتھ ہی ان کے دل نور ایمان سے چمک اٹھتے تھے اور اس داغ کو دھونے کے لیئے بیتاب ہو جاتے تھے' چنانچہ بعض صحابہؓ نے بارگاہ نبوت میں آ کر جس صداقت کے ساتھ اپنے جرائم کا اعتراف کیا ہے اس کی مثال دنیا کی مذہبی تاریخ میں ڈھونڈنا بے سود ہے' اسلام میں جرائم کی سزائیں جو نہایت سخت مقرر کی گئی ہیں مثلاً چوری کے جرم میں ہاتھ کاٹے جاتے ہیں۔ زنا کی سزا میں کوڑے لگائے جاتے ہیں' یا سنگسار کیا جاتا ہے تو اس میں اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے اور یہی حکمت لوگوں میں اعتراف جرم کا جذبہ پیدا کرتی ہے اور مجرم خود حاضر ہوتے تھے اپنے جرموں کا ازخود اعتراف کرتے تھے اور سزا جاری کرنے کے درخواست کرتے تھے۔

ماعزؓ بن مالک ایک صاحب تھے' انہوں نے ایک لونڈی کے ساتھ زنا کیا' جب انہیں

ہوش آیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں آ کر ازخود اس جرم کا اظہار کیا اور عرض کی: یارسول اللہ! مجھے پاک کیجئے (صحیح مسلم باب الرجم) یارسول اللہ! مجھ پر حد جاری فرمائی جائے' آپ ﷺ نے ان کی طرف سے منہ پھیر لیا' انہوں نے دوبارہ کہا کہ میں نے زنا کیا ہے مجھ پر حد جاری فرمایئے' اسی طرح وہ بار بار اعتراف جرم کرتے تھے اور آپ ﷺ اعراض فرماتے رہے' چوتھی بار آپ ﷺ نے فرمایا کہ کیا تم اس کے ساتھ ہمبستر ہوئے؟ انہوں نے کہا ہاں! آپ ﷺ نے فرمایا کہ کیا تم نے اس کے ساتھ مباشرت کی؟ انہوں نے کہا ہاں! آپ ﷺ نے فرمایا کیا تم نے اس کے ساتھ جماع کیا؟ انہوں نے کہا ہاں! ان تمام مراتب کے بعد آپ ﷺ نے ان کے سنگسار کرنے کا حکم دیا' جب ان پر پتھر برسنے لگے تو انہوں نے بھاگنا شروع کیا۔ بالآخر ایک صحابی نے بڑھ کر اونٹ کے پاؤں کی ہڈی اٹھا کر ماری اور وہ وہیں ٹھنڈے ہو گئے۔ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں اس کا ذکر کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ان کو چھوڑ کیوں نہ دیا۔ شاید وہ توبہ کرتے اور خدا ان کی توبہ قبول کر لیتا۔ (۴)۔

(۱)۔ مسلم ج ۲' کتاب القضائل۔ (۲)۔' (۳)۔ صحیح بخاری جلد اول کتاب الزکوہ باب اتقو النار ولو بشق تمرھت و کتاب الاجارھت باب من اجر نفسہ۔ (٤)۔ ابوداؤد ج ۲ ص ۱٤٥ و صحیح بخاری' کتاب الحدود۔

اس واقعہ سے قانونی سزا میں ایک نئی دفعہ کا اضافہ ہوا' کہ اگر کوئی مجرم اپنے جرم کی خود ذاتی اعتراف کی بنا پر سزا پا رہا ہو اور وہ اثنائے سزا میں بھاگ نکلنا چاہتا ہو تو اس کے فرار کو اقرار سے رجوع سمجھ کر اس کی باقی سزا معاف کر دی جائے گی اور اس کا معاملہ خدا کے سپرد ہو جائے گا۔

ایک اور نوجوان کا ذکر ہے جو شدید بیماری کی حالت میں اس گناہ میں مبتلا ہوئے اور کسی نے ان کو نہیں دیکھا لیکن انہوں نے ازخود اپنے تیمارداروں سے اس کا اقرار کیا

صحابہؓ نے ماعز پر اس لیئے پتھر برسائے کہ انہوں نے حکم الٰہی کی بے محابا تنقید کی توفیق پائی' دنیوی سلطنت میں مجرم کا بھاگ نکلنے کی کوشش کرنا ایک دوسرا جرم ہے' لیکن اسلام کے نظام سلطنت میں وہ توبہ کا ذریعہ ہے۔

(۱)۔ابوداؤد' باب فی اقامہت الحد علی المریض۔ (۲)۔ ایضا باب یصیب الرجل دون الجماع و صحیح بخاری حدود۔ (۳)۔ ابوداؤد' کتاب الدیات۔

اخلاقی اور دنیوی سلطنتوں کے طرز عمل میں اس موقع پر نمایاں امتیاز قائم ہو جاتا ہے جہاں کوئی مجرم خود سلطنت کو صدمہ پہنچانے کے لیئے کسی جرم کا ارتکاب کرتا ہے' ایک رحم دل دنیوی سلطنت خراج کو معاف کر سکتی ہے' بڑے بڑے جرائم درگزر کر سکتی ہے' رعایا کے ساتھ نہایت رفق و ملاطفت کا برتاؤ کر سکتی ہے لیکن وہ کسی بدخواہ سلطنت کے معمولی سے معمولی جرم سے اغماض نہیں برت سکتی' عہد نبوت میں بعض مسلمانوں نے بعض ایسے کام کیے جن سے بظاہر جنگی و سیاسی امور کو نقصان پہنچ سکتا تھا' مگر چونکہ ان کی نیت صاف تھی اور ان کے دل پاک تھے' اس لیئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے اس جرم سے صرف اس بنا پر چشم پوشی فرمائی کہ انہوں نے اس سے پہلے اسلام کی ایسی عظیم الشان خدمت انجام دی تھی جس سے ان کے ایمان کی سچائی پوری ظاہر ہو چکی تھی۔ حاطبؓ ابن بلتعہ ایک صحابی تھے' انہوں نے کفار قریش کے پاس ایک خط لکھا جس میں ان کو مسلمانوں کے مخفی حالات کی خبر دی تھی' یہ خط پکڑا گیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عرض کی کہ اس نے خدا' خدا کے رسول اور مسلمانوں کے ساتھ خیانت کی ہے' اجازت دیجئے کہ میں اس کی گردن اڑا دوں' لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حاطب سے پوچھا کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ حاطب نے کہا خدا کی قسم میرے ایمان میں کوئی خلل نہیں آیا ہے' خط لکھنے کی وجہ صرف یہ تھی کہ مکہ میں اپنی آل و اولاد کو چھوڑ کر جو مہاجرین چلے آئے ہیں' ان کا خاندان وہاں موجود ہے اور وہ ان کی حفاظت کرتا ہے'

حسن الظن من حسن العبادہت) (ابوداؤد کتاب الادب ص ۱۹۸) حسن ظن ایک قسم کی عبادت ہے۔

قران مجید نے اس کو اور واضح کر دیا ہے:

ان بعض الظن اثم۔

بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سیاسی اصول کے طور پر اس کی تعلیم دی:

ان الامیر اذا ابتغی الریبہت فی الناس افسد ھم۔

جو امیر لوگوں کے ساتھ بدگمانی کی جستجو کرے گا وہ ان کو برباد کر دے گا۔

اور عمال سلطنت کو اس اصول پر عمل کرنے کے ہدایت فرمائی ہے:

عن معاویہت قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علی وسلم یقول انک ان اتبعت عورات الناس افسدتھم و کدت ان تفسدھم۔

حضرت معاویہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا اگر تم لوگوں کے جرائم کی ٹوہ میں رہے تو تم نے یا تو ان کو برباد کر دیا ہے یا عنقریب برباد کر دو گے۔

چنانچہ جب تک حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کا دور قائم رہا' تمام معاملات میں اسی اصول پر عمل ہوتا رہا۔ حضرت عبداللہؓ بن مسعود کے سامنے ایک شرابی پیش کیا گیا اور اس کی نسبت کہا گیا کہ اس کی داڑھی سے شراب ٹپکتی ہے' لیکن چونکہ انہوں نے خود اس کو شراب پیتے ہوئے نہیں دیکھا تھا اس لیئے فرمایا کہ' ہم کو ٹوہ لگانے کی ممانعت کی گئی ہے۔ البتہ جو جرم علانیہ ہوتا ہے اس پر ہم مواخذہ کرتے ہیں۔

ذخین حضرت عقبہؓ بن عامر صحابی کے منشی تھے' انہوں نے ان سے شکایت کی کہ ہمارے ہمسائے شراب پیتے ہیں' میں نے ان کو منع کیا' وہ لوگ باز نہیں آئے' اب ان کے لیئے پولیس کو بلاتا ہوں' حضرت عقبہؓ نے فرمایا کہ ''درگزر کرو'' ذخین نے

دوبارہ کہا کہ اب وہ لوگ ترک شراب سے انکار کرتے ہیں' میں پولیس کو بلاتا ہوں' حضرت عقبہؓ نے پھر فرمایا کہ ''درگزر کرو'' کیونکہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے کہ:

من رای عورھت فسترھا کان کمن احیی موء ودھت (۱). جس نے کسی برائی کو دیکھ کر چھالیا اس کا درجہ اس شخص کے برابر ہے جس نے ان لڑکیوں کو بچالیا جو زندہ درگور کردی جاتی ہیں۔

اخلاقی حیثیت سے اس اصول کی خوبی میں کسی شخص کو کلام نہیں ہوسکتا' لیکن ہم کو صرف اسی پر اکتفا نہیں کرنا چاہئے' بلکہ یہ دیکھنا چاہئے کہ سیاسی حیثیت سے سلطنت پر اس اصول کا کیا اثر پڑ سکتا ہے ابن خلدون نے اس پر ایک مستقل مضمون لکھا ہے جس کا عنوان یہ ہے کہ تلوار کی دھار کا تیز کرنا سلطنت کے لیئے مضر ہے اور اس کو اکثر برباد کردیتا ہے' اس مضمون میں انہوں نے جو کچھ لکھا ہے' وہ تمام تر اسی سیاسی اصول کی شرح ہے جس کا اشارہ قول نبوی میں ملتا ہے' اس لیئے ہم اس موقع پر اس اصول کی سیاسی حیثیت کو نمایاں کرنے کے لیئے اس مضمون کا خلاصہ نقل کردینا کافی سمجھتے ہیں' وہ لکھتے ہیں:

---

(۱) یہ تمام حدیثیں ابوداؤد کتاب الادب ص ۱۹۰ باب فی النھی عن التجسس میں ہیں۔

جاننا چاہئے کہ رعایا کی مصلحت کا تعلق سلطان کی ذات' جسم' حسن' ڈیل ڈول' وسعت علم' حسن خط اور ذہانت کے ساتھ نہیں ہوتا' ان کی مصلحت کا تعلق صرف سلطان کی ذات کے ساتھ ہوتا ہے' اس لیئے ملک اور سلطنت ایک اضافی چیز ہے' اور دو شخصوں کے درمیان ایک قسم کا تعلق ہے' سلطان کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ وہ رعایا کا سردار اور ان کا سرپرست اور نگران ہے' اس لیئے سلطان وہ ہے جس کے پاس رعایا ہو اور رعایا وہ ہے جس کا کوئی سلطان ہے' اور اس نسبت سے جو صفت مستنبط ہوتی ہے' اسی کا نام بادشاہی ہے' پس جب یہ صفت اور اس کے لوازم ٹھیک

ہوتے ہیں تو سلطان کا مقصد کامل طور پر حاصل ہوتا ہے اگر وہ عمدہ ہے تو وہی رعایا کی عین مصلحت ہے' اور اگر وہ بری اور ظالمانہ ہے تو وہ ان کے لیئے مضر ہے اور ان کی ہلاکت کا سبب ہے' سلطان کی خوبیوں کا تمام تر دارومدار نرمی پر ہے' کیونکہ سلطان اگر ظالم ہو' سخت گیر ہو' لوگوں کے مصائب کی کرید کرے' ان کے جرائیم کو ایک ایک کر کے گنے تو رعایا پر خوف و ذلت طاری ہو جاتی ہے' اور لوگ ان سے بچنے کے لیئے جھوٹ اور مکروفریب کے دامن میں پناہ لیتے ہیں' اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یہی چیزیں ان کا اخلاق بن جاتی ہیں اور پھر ان کا ضمیر اور نظام اخلاق برباد ہو جاتا ہے' وہ جنگ کے موقعوں پر اس سے پہلو تہی کرتے ہیں' اور بسا اوقات ان کے قتل پر بھی آمادہ ہو جاتے ہیں اور اس سے خود سلطنت برباد ہو جاتی ہے' اور اگر اس قسم کے ظالم سلاطین کی حکومت قائم رہ جائے تو جذبہ محبت بالکل مٹ جاتا ہے' جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا لیکن اگر سلطان رعایا کے ساتھ نرمی کرے' ان کے گناہوں سے درگزر کرے تو وہ اس کے پہلو میں سو جاتے ہیں اور اس کے دشمنوں کے مقابل میں جان دے دیتے ہیں' پھر ہر پہلو سے سلطنت کا نظام ٹھیک ہو جاتا ہے' سلطنت کی خوبیوں کی اصل حقیقت یہ ہے لیکن اس کے لوازم وتوابع میں چند چیزیں اور بھی ہیں' مثلاً ان پر احسان کرنا اور ان کی معاش کا خیال رکھنا کہ یہ بھی ایک قسم کی نرمی ہے اور رعایا کی محبت حاصل کرنے کا سب سے بڑا اصول یہ ہے' جاننا چاہئے کہ یہ لوگ بیدارمغز اور تیز فہم ہوتے ہیں ان میں نرمی بہت کم پائی جاتی ہے' نرمی اکثر سیدھے سادھے اور بھولے بھالے لوگوں میں پائی جاتی ہے' بیدارمغز لوگوں کی نگاہ چونکہ دوررس ہوتی ہے اور وہ ابتدا ہی سے انجام کار کو پیش نظر رکھتے ہیں' اس لیئے لوگوں کو تکلیف مالایطاق دیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ تباہ ہو جاتے ہیں' اسی بنا پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ کمزور لوگوں کی روش اختیار کرو' اور حاکم کے لیئے یہ شرط قرار دی ہے کہ وہ بہت چالاک نہ ہو' چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ

عنہ نے جب زیاد بن سفیان کو معزول کیا تو انہوں نے کہا: کیا میں اس منصب کے فرائض کو انجام نہیں دے سکتا؟ یا میں نے کوئی خیانت کی ہے؟ حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ یہ کچھ نہیں، میں نے تم کو صرف اسی بنا پر معزول کیا ہے کہ میں رعایا پر تمہاری عقل کا بوجھ ڈالنا نہیں چاہتا۔

ابن خلدون نے ان خطروں میں جو آئین جہاں بانی پیش کیا ہے، اس پر اگرچہ دنیوی سلطنتوں میں بھی عمل کیا جا سکتا ہے، لیکن اسی طرز عمل کا جو دوسرا پہلو ہے یعنی یہ کہ اس نرمی کے برتاؤ سے رعایا میں خیرہ سری، جرائم سے بے پرواہی اور احکام سلطنت کے عدم تعمیل کا خیال نہ پیدا ہو جائے اور ضعیف حکمرانوں کی نرمی سے جرائم سے بے پرواہی اور احکام سلطنت کے عدم تعمیل کا خیال نہ پیدا ہو جائے اور ضعیف حکمرانوں کی نرمی سے یہ باتیں سلطنتوں میں پیدا ہوتی ہیں، مگر اسلام نے جس تخیل پر سلطنت کی بنیاد رکھی ہے، وہ سراسر مذہبی ہے اس میں امیر کے احکام کی اطاعت خدا کی خوشنودی کا باعث اور اس کا انکار آخرت کا گناہ بتایا گیا ہے، اس لیئے جہاں تک ممکن ہو قانون شریعت کے اس پہلو یعنی نرمی سے کام لیا جائے، جس سے لوگوں میں اطمینان پیدا ہو، جرائم کی تحقیق میں شہادت کا اصول اونچا ہو، عدل میں صداقت کی خلاف ورزی نہ ہو، امیر و غریب اور اونچ اور نیچ قانون کی نظر میں برابر ہوں، مجرموں کو اس وقت تک سزا نہ دی جائے جب تک شہادت اپنے پورے شرائط کے ساتھ ثابت نہ ہو جائے، اثبات جرم میں شکوک و شبہات کے موقع پر مجرم سے حدود کو ساقط کیا جائے اور قساوت اور سنگدلی کی ان تمام سزاؤں کو جو ظالم و جابر بادشاہوں نے جاری کر رکھی تھیں۔ ان کو یک قلم منسوخ کر دیا جائے، چنانچہ فرمایا:

ان اللہ یعذب الذین یعذبون فی الدنیا بے شبہہ خدا ان لوگوں کو عذاب دے گا جو لوگوں کو دنیا میں عذاب دیتے ہیں صحابہ کے آخر دور میں جب خلافت نے سلطنت کی صورت اختیار کر لی اور ظلم و ستم کی ہنگامہ آرائیاں شروع ہوئیں تو جن بزرگوں

نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فیض صحبت اٹھایا تھا' انہوں نے اسی حدیث کے ذریعہ سے عمال کی دست درازیوں کو روکنا چاہا' ایک بار حضرت ہشام بن حکیم بن حزام کا گزر شام میں ہوا تو دیکھا کہ چند نبطی' دھوپ میں کھڑے کیے گئے تھے' انہوں نے اس کی وجہ پوچھی' لوگوں نے کہا کہ جزیہ کے بارے میں ان کو یہ سزا دی گئی ہے' انہوں نے کہا: شہادت دیتا ہوں کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے کہ خدا ان لوگوں کو عذاب دے گا جو لوگوں کو دنیا میں عذاب دیتے ہیں۔ (۱)۔

دنیوی حکمراں لطف ومحبت کا برتاؤ زیادہ سے زیادہ اپنی قوم کے ساتھ کر سکتے ہیں' غیر قوموں کے ساتھ مہذب سے مہذب سلطنت کا برتاؤ بھی کچھ نہ کچھ ظالمانہ ہوتا ہے' لیکن ہشام بن حکیم بن حزام نے اس حدیث کو اس موقع پر بیان کیا جب کہ غیر قوموں کے آدمیوں پر ظلم کیا جا رہا تھا' اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کا نظام سلطنت کسی خارجی اثر سے اس اصول پر قائم نہیں ہوا تھا' بلکہ لطف ومحبت اس کا خمیرہ تھا' اور اس لیئے یہ ابر کرم ہر قوم کے سر پر سایہ افگن تھا' معاملات حکومت میں خود آپ کا طرز عمل اس قدر فیاضانہ اور آسان تھا کہ لوگ آپ کی خدمت میں جرائم کا اعتراف اس بنا پر کرتے تھے کہ آپ اس میں کوئی تخفیف یا آسانی پیدا کریں گے' مسلمان تو مسلمان غیر قوموں کو بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس فیاضانہ طرز عمل کا اعتراف تھا' چنانچہ یہودیوں میں دو مرد دو عورت نے زنا کیا تو تمام یہودیوں نے بالاتفاق کہا کہ ہم کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خدمت میں ان کو لے چلنا چاہئے کیونکہ وہی ایک ایسے پیغمبر ہیں جو تخفیف کو لے کر مبعوث ہوئے ہیں۔ (۲)۔ یعنی سزا میں نرمی برت سکتے ہیں۔

ایک شخص آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ میں سزا کا مستحق ہوں' مجھ پر حد جاری فرمایئے' آپ ﷺ نے پوچھا کیا وضو کر کے چلے تھے؟ اس نے کہا ہاں'

اس ڈر سے کہ روزوں میں ان سے کوئی بے عنوانی نہ ہو جائے۔ اس سے بچنے کی یہ تدبیر کی کہ انہوں نے اپنی بیوی سے رمضان میں ظہار (۳)۔ کرلیا' لیکن آخر ایک (۴)۔ رات کو بے قابو ہو کر بیوی سے مباشرت کرلی' صبح کو گھبرا کر انہوں نے اپنے لوگوں سے کہا کہ مجھے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں لے چلو' سب نے ساتھ چلنے سے انکار کیا تو خود تنہا آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر جرم کا اعتراف کرلیا' آپ ﷺ نے دوبار فرمایا: کیا تم نے ایسا کیا؟ انہوں نے دونوں دفعہ جواب میں عرض کی ہاں! ہاں! یا رسول اللہ مجھ ہی سے یہ حرکت ہوئی اور اب خدا کا جو حکم ہو اس کو صبر کے ساتھ انگیز کرنے کو تیار ہوں' تو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو جو کہا ہے آپ ﷺ نے فرمایا: ایک غلام آزاد کردو' انہوں نے اپنی گردن پر ہاتھ مار کر کہا کہ یا رسول اللہ اس گردن کے سوا تو میرے قبضہ میں کوئی غلام نہیں' آپ ﷺ نے فرمایا کہ مستقل دو مہینے کے روزے رکھو' عرض کی یا رسول اللہ! ہم نے تو خود رات فاقہ سے بسر کی ہے' آپ ﷺ نے ان کی یہ بات سن کر ارشاد فرمایا کہ صدقہ بنو زریق کے عامل کے پاس جاؤ' تم کو اس قدر کھجوریں دے دے گا اس میں ساٹھ فقیروں کو بھی کھلاؤ اور جو بچ رہے وہ اپنے بال بچوں کو کھلاؤ' وہ پلٹے تو لوگوں سے کہا کہ میں نے تمہارے یہاں تنگی و بدتدبیری اور رسول اللہ ﷺ کے یہاں وسعت اور مشورہ نیک پایا۔

(۱)۔ مسلم ج ۲' ص ۲۹۴ (۲)۔ بخاری ج ۲ ص ۹۰۰۔ (۳)۔ اظہار کے معنی یہ ہیں کہ بیوی کو محرمات شرعی سے تشبیہ دے دی جائے' جیسے کوئی یہ کہے آج سے تو میری ماں برابر ہے' اس صورت میں کفارہ لازم آتا ہے۔ (۴)۔ اس زمانہ میں رمضان میں رات کو مباشرت کی اجازت کا حکم نازل نہیں ہوا تھا۔

مسلمانوں کی طرف سے اخلاص و عقیدت اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے شفقت اور لطف و کرم کے اس دوگونہ جذبے نے رعایا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ اس قدر شیفتگی پیدا کردی تھی جس کی جھلک سلاطین

دنیوی کے تاجہائے مرصع اور ان کے لباسہائے فاخرہ میں نظر نہیں آ سکتی عرب کے بدوؤں کی مطلق العنانی، خودسری اور سرکشی کی جو داستانیں عام طور پر بیان کی جاتی ہیں اور جن کی بنا پر خیال کیا جاتا ہے کہ ان کی وجہ سے نہ عرب میں کوئی نظام سلطنت کبھی قائم ہوا ہے اور نہ ہو سکتا تھا، لیکن جب اسلام کا نظام سلطنت قائم ہوا اور اسلامی احکام نافذ کیے گئے تو ان ہی خودسر، سرکش اور مطلق العنان بدوؤں نے ان احکام کو کس سادگی اور جوش عقیدت کے ساتھ قبول کر لیا اس کا اندازہ ان واقعات سے ہو سکتا ہے جو عہد نبوت میں پیش آئے، ایک دفعہ ایک بدو نجد سے چل کر مدینہ آیا سفر سے پریشان، بال الجھے ہوئے اور اسی حالت میں خدمت نبوی ﷺ میں حاضر ہوا اور شریعت کے احکام پوچھے فرمایا: دن رات میں پانچ وقت کی نمازیں، عرض کی: کچھ اور نمازیں بھی؟ فرمایا نہیں، لیکن یہ کہ نفل پڑھو، پھر فرمایا: اور رمضان کے روزے، سوال کیا کہ کچھ اور روزے بھی؟ فرمایا نہیں، لیکن یہ کہ نفل رکھو، پھر زکوٰۃ کو ذکر فرمایا: اس نے پھر پوچھا کہ اس کے سوا بھی کچھ صدقہ؟ فرمایا نہیں، مگر یہ کہ تم خود اپنی مرضی سے دو، اتنا سوال و جواب کر کے یہ کہتا ہوا چلا کہ خدا کی قسم میں ان میں کمی بیشی نہ کروں گا، یہ سن کر حضور ﷺ نے فرمایا یہ شخص کامیاب ہو گیا۔ اگر سچا نکلا (بخاری، کتاب الایمان)

ایک اور واقعہ ہے کہ صحابہ مجلس میں حاضر تھے کہ ایک بدو نے آ کر کہ: آپ کا قاصد ہمارے پاس آیا اور اس نے ہم سے کہا کہ آپ ﷺ کہتے ہیں کہ آپ ﷺ خدا کے رسول ہیں اور آپ ﷺ کو خدا نے بھیجا ہے، ارشاد ہوا: اس نے سچ کہا، اس نے کہا: آسمان کو کس نے پیدا کیا؟ فرمایا: اللہ تعالیٰ نے، اس نے پھر کہا ان میں ہمارے فائدے کی چیزیں کس نے بنائی ہیں؟ فرمایا: اللہ عزوجل نے، اس نے کہا: اس خدا کی قسم جس نے آسمان کو پیدا کیا اور زمین کو بنایا، اور پہاڑ کو کھڑا کیا اور ان میں فائدے رکھے، کیا سچ مچ اللہ ہی نے آپ ﷺ کو بھیجا ہے؟ فرمایا ہاں، اس نے پھر

عرض کی کہ آپ ﷺ کے قاصد کا بیان تھا کہ ہم پر پانچ وقتوں کی نمازیں ہیں اور ہمارے مال میں زکوٰۃ ہے؟ فرمایا: اس نے سچ کہا' کہا: قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ ﷺ کو بھیجا' کیا خدا نے آپ ﷺ کو یہ حکم دیا ہے؟ فرمایا: ہاں! سچ کہا' عرض کی: اس کی قسم جس نے آپ ﷺ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے' میں ان احکام کی تعمیل میں کچھ گھٹا بڑھا نہیں کروں گا' ارشاد ہوا اگر یہ سچ کہتا ہے تو جنت میں داخل ہوگا (بخاری)۔

ایک اور مجلس میں صحابہ حاضر خدمت تھے اور حضور ﷺ ٹیک لگائے تشریف فرما تھے اتنے میں ایک شتر سوار آیا اور مسجد میں داخل ہوا' پھر اونٹ سے اترا اور مسجد ہی میں اونٹ کو باندھ دیا' پھر مجمع کے پاس آ کر پوچھنے لگا' تم میں محمد ﷺ کون ہیں؟ لوگوں نے کہا کہ وہ گورے آدمی جو ٹیک لگائے ہیں اس نے کہا کہ اے عبدالمطلب کے بیٹے! حضور نے فرمایا: ہاں کہو! اس نے کہا میں تم سے کچھ پوچھوں گا اور سختی سے پوچھوں گا تو تم رنجیدہ نہ ہونا' فرمایا جو چاہو پوچھو' اس نے کہا: میں تمہارے پروردگار اور تم سے پہلوں کے پروردگار کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا تم کو اللہ نے سب لوگوں کے پاس رسول بنا کر بھیجا ہے؟ فرمایا: ہاں! پھر کہا خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا اللہ ہی نے آپ ﷺ کو حکم دیا ہے کہ پانچ وقتوں کی نماز پڑھیں؟ فرمایا: خدایا ہاں! پھر کہا خدا کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا اللہ ہی نے کہا کہ سال میں ایک مہینہ کا روزہ رکھیں؟ فرمایا: خدایا ہاں! پھر کہا خدا ہی کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کیا اللہ نے آپ ﷺ کو حکم دیا ہے کہ آپ ﷺ ہمارے دولتمندوں سے زکوٰۃ لیں اور ہمارے محتاجوں کو بانٹ دیں؟ فرمایا: خدایا ہاں اس نے کہا میں ایمان لاتا ہوں اس پر جس کو لے کر آپ ﷺ آئے ہیں۔ اپنے پیچھے والوں کا نائب ہو کر آیا ہوں میں ضمام بن ثعلبہ ہوں (بخاری' کتاب الایمان)۔

ذرا اس سادگی' بے تکلفی اور یقین کی دولت کی اس فراوانی کا منظر دیکھیے اور شیفتگی و

جانثاری کا ایک اور واقعہ سنیئے۔

خیر! یہ واقعات تو ان بدوؤں کے حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ پیش آئے، صحابہ کرام جن کا شرف یہ تھا کہ وہ حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جانثار تھے وہ بھی اگر ان بدوؤں کی طرف سے گزرے تو ان کے ساتھ بھی انہوں نے اسی محبت کا ثبوت دیا، براء بن عاذبؓ ایک صحابی تھے ان کا اونٹ ایک دفعہ کھو گیا تھا، وہ اس کو ڈھونڈنے نکلے تو بدوؤں میں پہنچ گئے، بدوؤں کو جب معلوم ہوا کہ یہ کون ہیں تو حضور کے تعلق سے وہ ان پر گھوم گھوم کر نثار ہونے لگے (ابوداؤد کتاب الحدود صفحہ ۱۴۹)

رعایا کی وفاداری خلوص جوش عقیدت کا سب سے بڑا امتحان گاہ میدان جنگ ہے آنحضرت ﷺ کی زندگی کا بڑا حصہ میدان جہاد ہی میں بسر ہوا ہے صحابہ نے جس جوش کے ساتھ آپ کی حفاظت کی ہے اور جس خلوص کے ساتھ آپؐ پر جانیں نثار کی ہیں اس کی نظیر روم و ایران کی تاریخ میں نہیں مل سکتی، چنانچہ صلح حدیبیہ کے متعلق جب کفار قریش کے نمائندہ عروہ بن مسعود نے آنحضرت ﷺ سے گفتگو شروع کی تو ایک صحابی مغیرہ بن شعبہؓ آپؐ کی پشت پر مسلح کھڑے ہوئے تھے، عروہ گفتگو کرتے تھے تو عرب کے طریقہ کے موافق آپؐ کی داڑھی پکڑ لیتے تھے لیکن جب جب ان کا ہاتھ آپؐ کی ریش مبارک کی طرف بڑھتا تھا مغیرہ تلوار کے قبض سے اس پر ٹھوکر مار کر کہتے کہ آپؐ کی ریش مبارک سے ہاتھ کو الگ رکھو عروہ نے اس جوش عقیدت سے متاثر ہو کر دوسرے صحابہ کی طرف نگاہ دوڑائی تو دیکھا کہ آپؐ کا لعاب دہن بھی گرتا تھا تو لوگ تبرکاً اس کو ہاتھ میں لے کر اپنے جسم اور چہرے پر ملتے تھے جب آپؐ کوئی حکم دیتے ہیں تو ہر شخص اس کے بجالانے کے لیئے سبقت کرتا ہے جب آپ وضو کرتے ہیں تو لوگ وضو کے پانی کو تبرکاً لینے کے لیئے ٹوٹ پڑتے ہیں جب آپ گفتگو فرماتے ہیں تو ہر شخص کی آواز پست ہو جاتی ہے لوگ ادب اور تعظیم سے آپؐ کی طرف نگاہ جما کر نہیں دیکھ سکتے، وہ اس منظر جاہ و جلال کو دیکھ کر

پلٹے تو اپنی قوم سے کہا کہ میں اکثر بادشاہوں کے دربار میں حاضر ہو چکا ہوں‘ میں قیصر وکسریٰ اور نجاشی کے دربار میں بھی گیا ہوں‘لیکن میں کسی بادشاہ کے یہاں نہیں دیکھا کہ اس کے اصحاب اس کی اس قدرت عزت کرتے ہیں جس قدر محمدؐ کے اصحاب محمدؐ کی تعظیم کرتے ہیں جب وہ تھوکتے ہیں تو لوگ اس کو ہاتھ میں لے کر اپنے جسم اور چہرے پر ملتے ہیں‘ جب آپؐ ان کو کوئی حکم دیتے ہیں تو ہر شخص اس کے بجالانے کیلیئے پیش دستی کرتا ہے‘ جب آپؐ وضو کرتے ہیں تو ہر شخص وضو کے پانی کے لیئے لڑتا ہے‘ جب آپؐ کلام کرتے ہیں تو ہر شخص کی آواز پست ہو جاتی ہے‘لوگ تعظیماً آپؐ کی طرف نگاہ جما کر دیکھ نہیں سکتے ۔(۱)۔

(۱)۔بخاری ج ۱ ص ۳۷‘ کتاب الشروط۔

غزوۂ بدر کے متعلق جب آپﷺ نے انصار سے مشورہ کیا تو اس موقع پر حضرت سعدؓ بن عبادہ کی زبان سے جو فقرے نکلے وہ جوش‘ خلوص‘ عقیدت‘ محبت اور وفاداری کے جذبات سے لبریز تھے انہوں نے کہا:

ایانا نرید یا رسول اللہ والذی نفسی بیدہ لوامرتنا ان نخیضھا البحر لاخضناھا ولو امرتنا ان نضرب اکبادھا الی برک الغماد لفعلنا (مسلم کتاب الجہاد باب غزوئہ بدر)

یارسول اللہ! کیا آپ کا اشارہ ہماری طرف ہے‘اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر آپﷺ کا حکم ہو کہ ہم اس سمندر میں اپنے گھوڑے ڈال دیں تو ہم ڈال دیں گے اور اگر حکم ہو کہ ہم اپنی سواریوں سے برک الغماد (۱)۔پر دھاوا کریں تو ہم کر دیں گے ۔

غزوۂ احد میں جب آپﷺ نے کنار کی جمعیت کو ذرا گردن بڑھا کر دیکھنا چاہا تو حضرت ابو طلحہﷺ نے جن الفاظ کے ذریعہ سے آپﷺ کو روکا اُس سے زیادہ جوش محبت کی تفسیر کیا ہو سکتی ہے‘انہوں نے کہا:

بابی انت و امی لا تشرف یصبک سھم من سھام القوم نحری دون نحرک۔ (بخاری کتاب المغازی' غزوئہ احد)

میرے ماں باپ آپ پر قربان' آپ گردن بڑھا کر نہ دیکھیے کہیں آپ کو کوئی تیر نہ لگ جائے' میرا سینہ آپ کے سینہ کے سامنے ہے۔

خیر یہ تو صحابہ اور حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے درمیان واقعات تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحبت یافتہ یعنی صحابہ غیر قوموں میں گئے تو ان کی محبوبیت کا یہی عالم تھا' چنانچہ غیر قوموں کو عمال نبوی کی سادگی اور انصاف پسندی کا منظر نظر آتا تھا' تو وہ بھی ان کی گرویدہ ہو جاتی تھیں' فتح خیبر کے بعد وہاں کی پیداوار کی تقسیم کے لیئے آپ ﷺ نے حضرت عبداللہ ابن رواحہ کو مقرر فرمایا' وہ وہاں گئے اور تخمینہ کر کے ہر کھجور کے درخت سے ایک خاص مقدار وصول کرنا چاہئی' اس پر یہودیوں نے کہا ''یہ تو بہت ہے۔'' انہوں نے کہا اچھا! میں تخمینہ کر دیتا ہوں' تم لوگ اس کا نصف لے لینا' اس انصاف پسندی سے یہودی اس قدر متاثر ہوئے کہ سب کے سب یک زبان ہو کر پکار اٹھے:

ھذا الحق بہ تقوم السماء و الارض قد رضینا ان تاخذہ بالذی قلت۔ (۲)۔

انصاف اسی کا نام ہے اور اسی انصاف سے آسمان و زمین قائم ہیں جو کچھ تم نے کہا ہم اس کے قبول کرنے پر راضی ہیں۔

فتوح البلدان بلاذری میں ہے کہ یہودیوں نے ان کو رشوت دینا چاہی' لیکن انہوں نے کہا: اے دشمنان خدا تم مجھ کو حرام کھلانا چاہتے ہو' خدا کی قسم میں ایک ایسے شخص کے پاس سے آیا ہوں' جو محبوب ترین خلائق ہے اور تم کو میں بندروں اور سوروں سے بھی زیادہ مبغوض رکھتا ہوں لیکن تمہاری دشمنی مجھ کو عدل و انصاف کی راہ سے نہیں ہٹا

سکتی' یہ سن کر تمام یہودیوں نے کہا کہ آسمان و زمین اسی انصاف سے قائم ہیں۔ (۳)۔

(۱)۔یمن کی سمت میں ایک مقام کا نام۔ (۲)۔ ابوداؤد ج ۲ ص ۵۷' کتاب البیوع۔ (۳)۔ فتوح البلدان بلاذری مطبوعہ یورپ ص ۳۱۔

WWW.IqbalCyberLibrary.Net
All rights reserved.
©2002-2006

# سلطنت اور دین کا تعلق

دنیا میں اس وقت دو قسم کی سلطنتیں ہیں، ایک وہ جس میں سلطنت کو مذہب سے قطعاً علیحدہ رکھا ہے اور یہ کہا گیا ہے کہ جو قیصر کا ہے وہ قیصر کو دو اور جو خدا کا ہے وہ خدا کو دو (۱)۔ اس تعلیم میں قیصر اور خدا دو متقابل ہستیاں فرض کی گئی ہیں، جن میں سے ایک کا حکم دوسرے سے بالکل الگ ہے، اسی بنا پر یورپ کی موجودہ سلطنتیں قائم ہوئی ہیں اور اسی کی بنا پر دین و دنیا کی دو علیحدہ حدیں بنائی گئی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ سلطنتیں خدا پرستی، دین داری، صداقت اور اخلاص نیت کے ہر منظر سے عاری اور خالی ہو کر رہ گئی ہیں۔

دوسری قسم کی سلطنت وہ ہے جس میں مذہب کو اس سے الگ نہیں رکھا گیا ہے، لیکن مذہب کی لطیف و نازک روح کو سلطنتی قوانین و آئین و ضوابط کی رسیوں میں اس طرح جکڑ دیا گیا کہ مذہب کی لطافت جاتی رہی اور رسوم و قوانین کی خشکی نے اس کی جگہ لے لی، یہودیت اور برہمیت اس کی بہترین مثال ہیں۔

اصل دین الٰہی ایک ہی ہے، ایک ہی رہا ہے، اور ازل سے ابد تک ایک ہی رہے گا اور وہ اسلام ہے ان الدین عنداللہ الا سلام۔

(خدا کے نزدیک دین اسلام ہے) اس دین کی جامعیت کی تشریح مختلف پہلوؤں سے کی گئی ہے اور کی جا سکتی ہے، انہی میں سے ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ سلطنت اور دین کا معتدل مجموعہ ہے، وہ ایسی سلطنت ہے جو ہمہ تن دین ہے یا ایسا دین جو سرتا پا سلطنت ہے مگر سلطنت الٰہی میں قیصر کا وجود نہیں، اس میں ایک ہی اعلیٰ حاکم و آمر مانا گیا ہے وہ حاکم علی الاطلاق اور شہنشاہ قادر مطلق اللہ تعالیٰ ہے۔

بادشاہی اس کی ہے، حکم اسی کا ہے فرمان صرف اسی کا صادر ہوتا ہے دوسرے مجازی حاکموں اور آمروں کا حکم اسی وقت مانا جاتا ہے جب وہ عین حکم الٰہی ہو، یا اس کا مبنی ہو اور کم از کم یہ کہ اس کے مخالف نہ ہو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس دین کے

سب سے آخری داعی، نبی اور پیغمبر تھے اور وہی اس سلطنت کے سب سے پہلے امیر، حاکم اور فرمانروا تھے، آپ ﷺ کے احکام کی بجا آوری عین احکام خدا کی بجا آوری ہے:

ومن یطع الرسول فقد اطاع اللہ۔ (نساء: ۱۱)

جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی۔

آپ ؐ کی وفات کے بعد یکے بعد دیگرے آپ ؐ کے جو جانشین اور خلفاء ہوئے ان میں بھی دین و دنیا کی یہی جامعیت تھی وہ جس طرح مسلمانوں کے امیر و حاکم اور ان کی سلطنت کے فرمانروا تھے، اسی طرح وہ دین کے پیشوا، امام اور مجتہد تھے اور ان کے احکام کی تعمیل بھی عین خدا اور رسول کے احکام کی تعمیل تھی اور اب بھی مسلمان بادشاہوں کے وہ احکام جو خدا اور رسول کے حکم کے خلاف نہ ہوں، ہر مسلمان پر واجب التعمیل ہیں، آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں:

(۱) بخاری۔

من اطاع امیری فقد اطاعنی و من عصی امیری فق عصانی۔

جس نے میرے امیر کا کہا مانا، اس نے میرا کہا مانا، جس نے میرے امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی۔

سلطنت اور دین کا یہ اتحاد اسلام کا سب سے بڑا نصب العین ہے، احکام الٰہی کی مطابق سلطنت کا اپنی رعایا کی خدمت کرنا اور رعایا کا اپنے امرا اور حکام کی اطاعت کرنا بھی اطاعت الٰہی ہے، بشرطیکہ دونوں کی نیت اور غرض اللہ تعالیٰ کے احکام کو بجالانا ہو، غرض اسلام کی نظر میں سلطنت اور دین میں تفریق کاموں کی نوعیت سے نہیں بلکہ کاموں کی غرض و غایت سے ہے، خدا کے لیئے اور خدا کی خوشنودی کے حصول کے لیئے سیاست و سلطنت سے متعلق جو کام بھی حسب حکم الٰہی کیا جائے وہ دین ہے، امام کی امامت، خلیفہ کی خلافت، راعی کی رعیت، والی کی ولایت، امیر کی

امارت' حاکم کی حکومت' رعایا کی نگرانی' قاضی کی دادگیری' عمال کا عمل' سپاہی کا قتال' مجاہد کا جہاد' محاصل کی ادائی' امراء کی واجبی اطاعت غرض سلطنت کے تمام متعلقہ شعبوں سے متعلق جو کام بھی حسب احکام الٰہی اللہ کے لیئے کیا جائے' وہ سب دین اور اطاعت اور موجب قربت ہے۔ سلاطین اگر اپنی سلطنت اور امراء اپنی امارت اور اسی طرح دوسری مفوضہ خدمات کے ذمہ دار اگر اپنی ذمہ داریوں اور خدمتوں کو چھوڑ کر شب و روز کسی گوشہ میں بیٹھ کر صرف یاد الٰہی میں مصروف رہیں۔ جب بھی وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اپنے فرائض سے غافل قرار پائیں گے' فرائض و واجبات و مسنونات کی بجا آوری کے بعد ان کی بہترین عبادت یہی قرار دی گئی ہے کہ وہ خلوص کے ساتھ اپنے محولہ فرائض کی بجا آوری میں مصروف رہیں' حضرت داؤدؑ کا جو قصہ سورۂ ص میں ہے جس میں چند دادخواہوں کا دیوار پھاند کر حضرت داؤد علیہ السلام کے عبادت خانہ میں داخل ہو جانے کا اور ایک مقدمہ کے پیش کرنے کا ذکر ہے' قصہ خوانوں نے اس کو ایک بیہودہ کہانی بنا دیا ہے' حالانکہ وہ ان کی تنبیہ اس باب میں ہے کہ فرائض کی ادائیگی کے بعد خلیفہ کی سب سے بڑی عبادت رعایا کی خدمت' ان کے معاملات کی دادگیری اور ان کے کاموں کی نگرانی ہے اور یہی احساس فرض ہے جس پر حضرت داؤد علیہ السلام کو متنبہ کیا گیا:

وظن داؤد انما فتنه فاستغفر ربه وخر راكعا واناب فغفرنا له ذلك ان له عندنا لزلفى وحسن مآب يداود انا جعلناك خليفة فى الارض فاحكم بين الناس بالحق ولا تتبع الهوى فيضلك عن سبيل الله۔ (ص: ۲)

اور داؤد نے سمجھا کہ ہم نے (یعنی خدا نے) ان کو آزمایا ہے تو اپنے پروردگار سے انہوں نے معافی چاہی اور رکوع میں گر گئے اور رجوع کیا تو ہم نے ان کو معاف کر دیا اور ان کو ہمارے ہاں قرب کا درجہ اور پھر آنے کی اچھی جگہ حاصل ہے'

اے داؤد! ہم نے تم کو زمین میں خلیفہ بنایا تو لوگوں کے
درمیان حق کے ساتھ حکم کر اور خواہش نفس کی پیروی نہ کرنا
کہ وہ تم کو اللہ کے راستہ سے ہٹا دے گا۔

---

(۱)۔ صحیح بخاری کتاب الاحکام ج ۲' ص ۱۰۵۷ و صحیح مسلم کتاب الامارہ ج ۲' ص ۲۲۳ مصر۔

---

آگے پیچھے کی آیتوں کے درمیان ربط و نظم سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام سلطنت کے فرائض اور مقدمات کے فیصلوں کو چھوڑ کر عبادت خانہ کے دروازہ کو بند کر کے خدا کی عبادت میں مصروف رہنے لگے' تو اس پر اللہ تعالی کی طرف سے ان کو تنبیہ کی گئی اور بتایا گیا کہ خلیفہ کا فرض یہ ہے کہ حسب احکام الہی فرائض خلافت کی ادائیگی میں مصروف رہے۔

جامع ترمذی اور مستدرک حاکم میں ایک حدیث ہے جو گویا اس آیت کی تفسیر ہے' آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

مامن امام یغلق بابه من ذوی الحاجته و الخلهت
والمسکنهت الا اغلق الله ابواب السماء دون خلته
وحاجته و مسکنته (ترمذی ابواب الاحکام:۲۲۷)

جو امام و حاکم ضرورت مندوں سے اپنا دروازہ بند کر لیتا ہے'
اللہ تعالی اس کی ضرورت کے وقت آسمان کا دروازہ بند
کر لے گا۔

من ولی من امر المسلمین شیئا فاحتجب دون
خلتهم وحاجتهم و فقرهم و فاقتهم احتجب الله
عزوجل یوم القیامهت دون خلته وفاقته و فقره
(مستدرک حاکم کتاب الاحکام: ۴'۲ ص ۹۳
حیدر آباد)

جو شخص مسلمانوں کے معاملہ کا ذمہ دار ہونے کے بعد ان کی
ضرورت کے وقت اوٹ میں ہو جائے گا اللہ تعالی قیامت

پبلک مقامات' مساجد اور عدالت گاہوں میں نہ اس اجازت کی ضرورت ہے اور نہ ایسے پہرہ داروں کی۔

ان اللہ یامرکم ان تؤدوا الامٰنٰت الی اھلھا و اذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل ان اللہ نعما یعظکم بہ ان اللہ کان سمیعا بصیرا یاایھاالذین امنوا اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم فان تنازعتم فی شیء فردوہ الی اللہ والرسول ان کنتم تؤمنون باللہ والیوم الاخر ذلک خیر واحسن تاویلا۔
(نساء:۸)

امانت والوں کی امانتیں ان کے حوالے کردیا کرو' اور جب لوگوں میں فیصلہ کرنے لگو تو انصاف سے فیصلہ کیا کرو' خدا تمہیں بہت خوب نصیحت کرتا ہے' بیشک خدا سنتا (اور) دیکھتا ہے' مومنو! خدا اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرو اور جو کوئی تم میں صاحب حکومت ہیں ان کی بھی' اور اگر کسی بات میں تم میں اختلاف واقع ہو تو اس میں خدا اور اس کے رسول (کے حکم) کی طرف رجوع کرو' یہ بہت اچھی بات ہے اور اس کا مال بھی اچھا ہے۔

یہ آیتیں اسلامی سلطنت کے آئین کے باب میں اساسی حیثیت رکھتی ہیں' جس کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی آیت پاک کا پہلا ٹکڑا اپنے معنی کے لحاظ سے اہل تفسیر کی تصریح کے مطابق' اس کا اطلاق حکام پر بھی ہوتا ہے اور یہ بات کہہ کر ہر صاحب حق کو اس کا حق ادا کیا جائے' امانت کا اعلیٰ درجہ اور حکومت کا پہلا فرض ہے:

واقیموا الوزن بالقسط ولا تخسروا المیزان۔
(رحمٰن: ۱)

اور تول کو انصاف کے ساتھ قائم کرو' اور میزان میں کمی نہ کرو۔

یہ اور اسی معنی کی اور آیتیں اس امر کو واضح کرتی ہیں کہ حقوق کی ادائیگی میں پورا انصاف برتا جائے' اور جس پیمانہ سے تم دوسروں کے لیئے تولتے ہو' اسی پیمانہ سے

اپنے لیئے بھی تولو:

ویل للمطففین الذین اذا اکتالوا علی الناس یستوفون واذا کالوھم اوزنوھم یخسرون (مطففین: ۱)

پھٹکار ہو ان تول میں بے ایمانی کرنے والوں پر جو لوگوں سے تول کر لیں تو پورا پورا لیں، اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیں تو گھٹا دیں۔

یہ تول میں گھٹانا اور بڑھانا انصاف کے خلاف ہے، اور خلاف انصاف کرنے والا اللہ کی رحمت سے محرومی رہے گا، اللہ کی محبت کی مستحق منصف اور عدل پر ور ہی ہیں:

ان اللہ یحب المقسطین (مائدہ:حجرات:۹)

اور اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پیار کرتا ہے۔

اس آیت کی وسعت میں ہر طبقہ کے انصاف کرنے والے داخل ہیں۔

اس کے برخلاف کرنے والوں کی متعلق ارشاد ہے:

واللہ لا یحب الظلمین (آل عمران:۱۴۰۲)

اور اللہ ظلم کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

انہ لا یحب الظلمین (شوریٰ:۴)

بے شک وہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔

ظلم کے معنی کسی دوسرے کے حق کو دبانے کے ہیں، چاہے وہ اپنے ہی نفس کا ہو یا خدا تعالیٰ کا ہو، ان آیتوں سے مقصود یہ ہے کہ حکومت اور اس کے فرائض اسلام میں دین کی حیثیت رکھتے ہیں جس سے بحسن وخوبی عہدہ برآ ہونا ثواب اور اس میں قصور گناہ ہے اور بحسن وخوبی عہدہ برآ ہونا یہی ہے کہ وہ احکام الٰہی کے تحت ادا ہوں۔

ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الفاسقون۔ (مائدہ:۷)

اور جو اللہ کے اتارے ہوئے احکام کے مطابق حکم نہ کریں وہی نافرمان ہیں۔

بنسجته الالم یجد رائحہت الجنہت (بخاری و مسلم حوالہ سابق)

جس بندہ کو اللہ کسی رعیت کا نگران بنائے اور وہ اس کی خیر خواہی پوری نہ کرے تو وہ جنت کی بو بھی نہ پائے گا۔

حضرت معقلؓ بن یسار ایک صحابی ہیں ان کے مرض الموت میں بصرہ کا سفاک امیر عبید اللہ بن زیاد ان کی عیادت کو آیا انہوں نے امیر کو مخاطب کر کے فرمایا کہ آج میں تمہیں حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک پیغام سنا دینا چاہتا ہوں اگر مجھے معلوم ہوتا کہ میری زندگی ابھی اور باقی ہے تو میں نہ سناتا' میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ کہتے سنا ہے:

مامن عبد یسترعیہ اللہ رعیہت یموت یوم یموت وھو غاش لرعیتہ الاحرم اللہ علیہ الجنہت (مسلم' کتاب الامارہ)

جس بندہ کو اللہ کسی رعیت کا نگراں بنائے' وہ مرتے دم اس حال میں مرے کہ وہ اپنی رعیت کے ساتھ غداری کرتا تھا تو اللہ اس پر جنت کو حرام کر دے گا۔

اس سے اندازہ ہوگا کہ امارت وحکومت کی ذمہ داری اسلام کی شریعت میں کتنی بڑی ہے' ایک اور صحابی جن کا نام عائذ بن عمر رضی اللہ عنہ ہے' وہ مرض الموت کا بھی انتظار نہیں کرتے' عبید اللہ بن زیاد کے دربار میں خود پہنچ جاتے اور اس کو پیار سے خطاب کر کے کہتے ہیں اے بیٹے! میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے:

ان شر الرعاء الحطمہت (مسلم' کتاب الامارہ)

سب سے برا راعی (امیر) وہ ہے جو اپنے رعیت کو توڑ ڈالے۔

تو تو ان میں سے نہ بن' اس نے کہا: آپ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب میں بھوسی ہیں' فوراً بولے: کیا حضور ﷺ کے اصحاب میں کوئی بھوسی بھی تھا' بھوسی تو

اوروں میں تھے' اوران کے بعدوالے ہیں۔

حضورصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: بنی اسرائیل کی سیاست انبیاءفرمایا کرتے تھے' ایک نبی گزر جاتا تھا تو دوسرا نبی اس کا جانشین ہوتا تھا' لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا' نبوت مجھ پر ختم ہوگئی البتہ خلفا ہوں گے' اور بہت ہوں گے انہی کے ہاتھ میں امت کی سیاست کی باگ ہوگی' صحابہ نے عرض کی یارسول اللہ! تو ہمارے لیئے کیا حکم ہے؟ فرمایا پہلے کی بیعت کرو' پھر اس کے بعد والے کی' پھر عہد بہ عہد اوروں کی' ان کا حق ان کو ادا کیا کرو (یعنی اپنے حق کی پرستش خدا پر چھوڑدو)

فان اللہ سائلھم عما استرعاھم۔ (صحیح بخاری)

کیونکہ اللہ تعالی ان سے ان کے متعلق باز پرس فرمائے گا جن کی نگرانی اس نے ان کے سپرد فرمائی ہے۔

حضورصلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی امت کے امراء کے حق میں یہ دعا فرمائی ہے:

الھم من ولی من امر امتی شیئا فشق علیھم فاشقق علیہ ومن ولی من امر امتی شیئا فرفق بھم فارفق بہ۔ (مسلم)

اے اللہ! جوکوئی میری امت کی کسی بات کا یا حکومت کے کسی حصہ کا) بھی والی ہو اور وہ ان پر سختی کرے تو تو بھی اس پر سختی کرنا اور جو ان سے مہربانی سے پیش آئے تو تو بھی اس پر مہربانی فرما۔

حضورصلی اللہ علیہ وسلم کے ان الفاظ کی وسعت میں بادشاہ سے لے کر ادنٰی افسر تک شامل ہیں' اور ہر ایک پر اپنے اپنے دائرہ حکومت کی ذمہ داری عائد ہے' ایک اور حدیث پاک میں اس دائرہ کی وسعت اور زیادہ بڑھ گئی ہے:

الا کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیہت والرجل راع علی اھل بیتہ وھو مسئول عنھم والمراہت راعیہت علی بیت بعلھا و ولدہ وھی

مسئولہت عنھم والعبد راع علی مال سیدہ وھو مسئول عنہ الافکلکم راع و کلکم مسئول عن رعیہت (مسلم و صحیح بخاری)

ہاں! تم سب نگران کار ہو' اور تم سب سے اپنے زیر نگرانی اشخاص و رعایا کی بابت پوچھ ہوگی تو لوگوں کا امیر نگران کار ہے اس کے زیر نگراں کے متعلق پرسش ہوگی اور مرد اپنے گھروں والوں کا نگران کار ہے اور اس سے اس کے گھر والوں کی پرسش کی جائے گی اور عورت اپنے شوہر کے گھر اور بال بچوں کی نگراں ہے' اس سے ان کی متعلق سوال ہوگا' اور غلام اپنے آقا کے مال کا نگران ہے اس سے اس کی بابت پوچھا جائے گا' تو ہاں ہوشیار رہو' تم سب نگران کار ہو اور تم سے اس کے زیر نگران کے بابت باز پرس کی جائی گی۔

## لفظ رعیت ::

اس موقع پر مخصوص لفظ کی تحقیق مناسب معلوم ہوتی ہے' جو ہماری زبان میں عام طور پر رائج ہے اور وہ رعیت ہے' اور ذمہ داری کے لحاظ سے وہ اپنی حقیقت سے بالکل خالی ہوگئی ہے' حدیثوں میں لفظ راعی اور رعیت بار بار آئے ہیں' یہ الفاظ لفظ ''رعی'' سے نکلے ہیں' جس کے اصلی معنی جانوروں کے چرانے کے ہیں' راعی چرواہا اور رعیہت وہ ہے جس کو وہ چرائے اور جس کی وہ نگہبانی کرے' اس سے ظاہر ہے کسی کی رعیت وہ ہے جس کی تربیت و پرورش و نگرانی اور حفاظت کسی راعی و محافظ کے سپرد ہو تو درحقیقت ایک امیر کی حیثیت ایک شفیق و محافظ چرواہے کی ہے' جو اپنے گلے کو سرسبز چراگاہوں میں لے جاتا ہے' اور ان کی شکم سیری کا سامان کرتا ہے' درندوں سے ان کی حفاظت کرتا ہے اور حادثات سے ان کو بچاتا ہے' اس تشریح کے مطابق یہ غور طلب ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان مبارک پر لفظ ''رعیت'' کس

مامن امیر یلی امر المسلمین ثم لا یجد لھم الا لم ید
خل معھم الجنۃ (صحیح مسلم' کتاب الامارہ)

جو امیر مسلمانوں کے کام کا والی ہو' پھر وہ ان کے لیئے محنت نہیں کرتا اور ان کا خیر خواہ نہیں' وہ ان کے ساتھ بہشت میں داخل نہ ہوگا۔

مامن وال یلی رعیۃ من المسلمین فیموت وھو غاش لھم الا حرم اللہ علیہ الجنۃ (صحیح بخاری' کتاب الاحکام)

کوئی والی جو مسلمانوں کی کسی زیر نگرانی جماعت کا والی ہو' وہ اس میں مرے کہ وہ ان مسلمانوں کے ساتھ غداری کا مرتکب ہو' اس پر جنت حرام ہے۔

انما الامام جنۃ یقاتل من ورائہ ویتقی بہ فان امر بتقوی اللہ وعدل فان لہ بذالک اجرا وان امر بغیرہ فان علیہ وزرا (نسائی کتاب البیعۃ)

امام ڈھال ہے اس کے پیچھے اس کی پناہ میں لڑا جاتا ہے تو اگر وہ اللہ تعالی کے تقوی کے مطابق حکم کرے اور عدل کرے تو اس کو اس کا بڑا انعام ملے گا اور اگر غیر تقوی کا حکم کرے اور عدل نہ کرے تو اس کے لیئے بڑی سزا ہے۔

یہ حدیثیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ اسلام میں حکومت و ریاست اور سلطنت و ولایت بھی امور دین کا درجہ رکھتی ہیں اور وہ بھی ثواب وعذاب اور جزا و سزا کی اسی طرح موجب ہیں جس طرح دین کے دوسرے امور واعمال' اور وہ بھی ایک مسلمان کے سامنے جنت یا دوزخ کا دروازہ کھولنے میں اعمال وعبادات کے دوسرے شعبوں سے کم نہیں' اور اسلام کی شریعت میں یہ دین ہی کا ایک حصہ ہیں' کیونکہ یہاں دین کے معنی احکام الہی ہیں یا قوانین الہی ہیں۔ یہ احکام الہی اور قوانین الہی انسانی زندگی کے ہر شعبہ سے یکساں متعلق ہیں' اس بنا پر سلطنت وولایت اور حکومت

وریاست کے کاروبار کا نظم ونسق اور اہتمام وانصرام بھی دین ہی کا ایک جز ہے۔
ایک مدت سے علماء کی گوشہ گیری اور صوفیا کی خانقاہ نشینی نے عوام کو یہ یقین دلایا ہے کہ قیام سلطنت اور امور سلطنت میں دخل وتدبیر دنیا کا کام ہے' جس سے اہل علم اور اہل اتقاء کو کنارہ کش رہنا چاہئے حافظ شیرازی کا یہ مشہور شعر اسی تصور کا غماز ہے۔

گدائے گوشہ نشینی تو حافظا مخروش
رموز مملکت خویش خسروان دانند (۱).

(اے حافظ تو گدائے گوشہ نشین ہے' زیادہ شور وغل مت کر کہ اپنی مملکت کے رموز و اسرار بادشاہ ہی جانتے ہیں' تم کو ان سے کیا سروکار)!

لیکن اسلام اس خسروی کا قائل نہیں' اس کی نگاہ میں سلطنت احکام الٰہی کی تبلیغ اور اجرا کے لیئے ہے اور یہ عین دین ہے' اسلام میں جس قتال وجہاد کی دعوت برملا دی گئی ہے اور جس پر اخروی نعمتوں کے بڑے بڑے وعدے اللہ تعالیٰ نے فرمائے ہیں اور جس سے داعی اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حیات مقدس اور حضرات خلفاء راشدینؓ اور صحابہؓ اور صحابہ کرامؓ کی زندگیاں سرتا پا معمور ہیں' اس سے مقصود اصلی احکام الٰہی کی تبلیغ تنفیذ اور اجرا ہی تھا' جہاد سے فرار پر غضب الٰہی اور جہنم کی وعید ہے' اور میدان جہاد کے صبر وثبات پر صادق قدم اور متقی ہونے کی بشارت ہے' قرآن میں ہے:

---

(۱)۔ حافظ علیہ الرحمہ کی اس شعر کا یہ محل بھی ہو سکتا ہے کہ بندہ کو اللہ تعالیٰ کے احکام کے اسرار و مصالح کے تلاش نہیں کرنی چاہئے' جب کہ دنیا کے بادشاہ اپنے رموز و مصالح سے غیروں کو آگاہ نہیں کرتے' اگر کوئی بادشاہ کی مرضی کے خلاف ان کو جاننے کی کوشش کرتا ہے تو وہ سزا کا مستوجب قرار پاتا ہے' اسی طرح اللہ تعالیٰ کی تعلیم کے بغیر اپنی طرف سے احکام الٰہی کے رموز و اسرار کی تلاش و طلب نہیں کرنی چاہئے۔

یایھاالذین امنوا اذا لقیتھم الذین کفروا زحفا فلا تو
لوھم الادبار ومن یولھم یومئذ دبرہ الا متحر فا لقتال
او متحیزا الی فئہت باء بغضب من اللہ و ماء وائہ
جھنم وبئس المصیر (انفال: ۲)

اے اہل ایمان! جب میدان جنگ میں کفار سے تمہارا
مقابلہ ہوتو ان پر پیٹھ نہ پھیرنا اور جو شخص جنگ کے روز
اس صورت کے سوا لڑائی کے لیئے کنارے کنارے چلے
(یعنی حکمت عملی دشمن کو مارے) یا اپنی فوج میں جا ملنا چاہئے'
ان سے پیٹھ پھیرے گا تو (سمجھو کہ) وہ خدا کے غضب میں
گرفتار ہو گیا اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے' اور وہ بہت ہی بری
جگہ ہے۔

والصبرین فی البلساء والضراء وحین البلس اولئک
الذین صدقوا و اولئک ھم المتقون (بقرہ: ۲۲)

اور سختی اور تکلیف میں اور (معرکہ) کارزار کے وقت ثابت
قدم رہیں' یہی لوگ ہیں جو ایمان میں سچے ہیں اور یہی ہیں
جو خدا سے ڈرنے والے ہیں۔

یہی سبب ہے کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جہاد و قتال فی سبیل اللہ' انصاف' اقامت دین' تنفیذ حکم' امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے تمام کاروبار کو جس کا بڑا حصہ امامت و خلافت اور اس کے ماتحت شعبوں اور ضعیفوں سے متعلق ہے' عام عبادات و اعمال صالحہ سے کم اہم نہیں سمجھتے تھے بلکہ اس تصور اور عقیدہ کی بنا پر کہ اقامت دین کی راہ میں خون شہادت کا ایک قطرہ بھی مومن کے اعمال نامہ اور گناہوں کے دفتر کو دم کے دم میں دھو دیتا ہے' حضرات صحابہؓ ہر وقت جہاد و قتال کے مشتاق اور اس راہ میں شہادت کے طالب رہتے تھے۔

فالذین ھاجروا و اخرجوا من دیارھم و اوذو فی
سبیلی وقاتلوا وقتلوا لاکفرن عنھم سیئاتھم

ولا دخلنهم جنات تجری من تحتھا الانھار ثوابا من عنداللہ واللہ عندہ حسن الثواب۔ (آل عمران:۲۰)

تو جو لوگ میرے لیئے وطن چھوڑ گئے اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور ستائے گئے اور لڑے اور قتل کیے گئے میں ان کے گناہ دور کر دوں گا اور ان کو بہشتوں میں داخل کروں گا اور جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں (یہ) خدا کے ہاں سے بدلہ ہے' اور خدا کے ہاں اچھا بدلہ ہے۔

خود لفظ دین قرآن پاک میں کئی معنوں میں آیا ہے' ان میں سے ایک معنی احکام الٰہی کی اطاعت تنفید اور اقامت کے بھی ہیں' سورۂ نور میں ہے:

ولا تاخذ کم بھما راء فہت فی دین اللہ (نور:۱)

اوران دونوں مجرموں کے ساتھ اللہ کے دین میں تم کو رحم نہ آئے۔

کھلی بات ہے کہ اللہ کے دین سے مقصود یہاں احکام الٰہی کی تنفیذ واجراء ہے اسی طرح سورۂ بقرہ کی اس آیت میں:

و قاتلو ھم حتی لا تکون فتنہت ویکون الدین للہ۔(انفال:۴)

اوران سے اس وقت تک قتال کرتے رہنا کہ فساد نابود ہو جائے۔

صرف حکم الٰہی کی اطاعت کو ''دین'' فرمایا گیا ہے' سورۂ انفال کی اس آیت میں:

و قتلوھم حتی لاتکون فتنہت ویکون الدین کلہ للہ (انفال:۴)

اوران لوگوں سے قتال کرتے رہو' یہاں تک کہ فتنہ (کفر کا فساد) باقی نہ رہے اور دین سب خدا ہی کا ہو جائے۔

اس آیت میں بھی حکم و قانون الٰہی کی تسلیم و اطاعت ہی کو دین فرمایا گیا' یعنی یہ کہ اللہ تعالٰی کے سوا نہ کوئی اطاعت کے لائق ہے اور نہ عبادت کے' اسی کا ایک فیصلہ ہے

جو آسمان سے زمین تک جاری ہے۔ ان الحکم الا للہ (انعام'یوسف) الا لہ الحکم (انعام) ایک اور آیت میں ارشاد ہے:

ولہ مافی السموات والارض ولہ الدین واصبا۔ (نحل:۷)

اور اسی خدا کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے' اور اس کی لازمی اطاعت ہے۔

یہاں بھی دین کے معنی احکام الٰہی کی اطاعت ہی کے زیادہ موزوں اور نظم قرآنی کے مطابق ہیں۔

## سلطنت وملکیت کی حقیقت ::

اب دین کی تشریح کے بعد حکومت وسلطنت و ولایت کی تھوڑی تشریح کی ضرورت ہے عام لوگ حکومت وسلطنت کو عیش وتنعم کے ایوان زرنگار' تاج اور زمردیں' تخت کی روشنی اور زریں کمر بند غلاموں کے جھرمٹ میں تلاش کرتے ہیں' یا جلال و جبروت اور قہر و ہیبت کی تلواروں کے سائے میں' لیکن اسلام نے جس حکومت کی تعلیم دی ہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس تعلیم کی جو عملی مثال پیش کی ہے اور ان تمام مناظر سے قطعا خالی ہے۔

## اسلام نے ملکیت کے الفاظ ترک کردیئے ::

سلطنت وحکومت اور ولایت و ریاست کا رائج الوقت تخیل اسلام کے قانون میں اصلاً نہیں ہے' بلکہ اسلام نے سلطنت' حکومت اور بادشاہی وشہنشاہی کے الفاظ کو بھی جو ہر زبان میں رائج تھے' قطعا چھوڑ دیا' سب سے عام لفظ **ملک** کا تھا اور اس سے اونچا لفظ شہنشاہ کا تھا' ایران کے شہنشاہ کسری اور روم کے امیر قیصر کہلاتے تھے' مگر تعلیم محمد ﷺ نے اب سب لفظوں سے جو جبر وقہر اور ظلم وستم کے مظہر تھے' پرہیز کیا' الملک کے مادہ میں ملکیت اور مالکیت کا تصور ہے جو اسلامی عقیدہ کے سراسر منافی

میں پیدا ہو گیا تھا کہ اس لفظ کے ساتھ کسی نئی صفت کے بڑھائے بغیر اس مفہوم کا ازالہ نہیں ہو سکتا تھا اس لیئے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں جہاں جہاں اپنے لیئے اس لفظ کا استعمال کیا ہے اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی صفت ضرور لگا دی ہے۔

## لفظ ملک الملوک کی ممانعت ::

عربی میں **ملک** الاملاک یا **ملک** الملک اور فارسی میں شہنشاہ یعنی شاہ شاہاں بولا جاتا تھا اور اس کا تصور بادشاہوں کے تعلق سے ہر زبان میں مبالغہ کے ساتھ پایا جاتا ہے اسلام میں شاہ شاہاں' شہنشاہ' **ملک الملوک** صرف ایک ہے' اور اللہ تعالیٰ ہے' آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف ارشاد فرمایا:

ان اخنع الاسماء عند اللہ رجل تسمی ملک الاملاک (صحیح بخاری' کتاب الادب)

سب سے بدتر نام اللہ کے نزدیک یہ ہے کہ کوئی آدمی اپنے آپ کو شہنشاہ کہے۔

معانی جن الفاظ سے ادا کیے جاتے ہیں اگر ان کی اصلیت محفوظ ہو تو معلوم ہو گا کہ الفاظ کے اندر بڑی حقیقت چھپی رہتی ہے' اسلام کی زبان میں اپنی طرف حکومت کے فرد عامل کا نام خلیفہ اور اس کی حکومت کا نام خلافت ہے' خلیفہ عربی زبان میں قائمقام اور نائب کو کہتے ہیں' اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ وہ خود حاکم و فرمانروا نہیں بلکہ وہ اس حکومت میں کسی کا نائب اور قائم مقام ہے' سوال یہ ہے کہ وہ کس کی نیابت کرتا ہے اور کس کا قائمقام ہے؟

حضرت آدمؑ کا قصہ قرآن پاک اور توراۃ دونوں صحیفوں میں مذکور ہے' مگر دونوں کے نتیجے الگ الگ ہیں' توراۃ میں یہ بیان صرف آدمؑ کے آغاز پیدائش کی تاریخ کی حیثیت سے ہے' لیکن قرآن کا یہ بیان اسلام کی دینیات اور سیاسیات کا ایک بنیادی پتھر ہے' اسلام ایک طرف تو انسان کا مکلّف ہونا' اس کا اصلی مقام بہشت ہونا' جزا و

سزا کا راز' رسالت ونبوت کی ضرورت اور پیغمبروں کے آنے کی مصلحت اس قصہ سے ظاہر ہوتی ہے' دوسری طرف کائنات میں انسان کے اصلی مقام ومرتبہ کی تعین' دنیا میں اس کے فرائض' احکام الٰہی کی بجاآوری کی صورت اور خدا کی دوسری مخلوقات کے ساتھ اس کے برتاؤ کی حیثیت واضح ہو جاتی ہے پہلی چیز اسلام کے اساسی عقائد ہیں اور دوسری چیز اسلامی سیاسیات کے بنیادی مبادی ہیں۔(۱)۔

(۱)۔خلافت کی تحریک کے زمانہ میں خاکسار کے خیالات ادھر ہوئے تو سب سے پہلے اکتوبر ۱۹۲۰ء کے معارف میں آیت استخلاف کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا' جس میں اس کی تصریح کی گئی ہے' یہ مضمون آج بھی پیش نظر رکھنے کے قابل ہے۔

قرآن پاک میں اس قصہ کا آغاز ان لفظوں سے ہوا ہے:

واذ قال ربك للملئكهت انى جاعل فى الارض خليفهت (بقرہ:۴)

اور جب تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔

یہ خلیفہ حضرت آدمؑ تھے' جو تمام بنی آدم کے قائمقام ہو کر اس شرف سے ممتاز ہوئے' اس لیئے دوسرے موقعوں پر آدمؑ کے سارے بنی آدم کو اس شرف سے مفتخر اور ممتاز فرمایا گیا ہے' چنانچہ فرمایا:

ولقد كرمنا بنى ادم وحملنا هم فى البر والبحر و رزقنا هم من الطيبات و فضلناهم على كثير ممن خلقنا تفضيلا۔ (بنی اسرائیل:۷)

ہم نے آدم کے بیٹوں (بنی آدم) کو عزت بخشی' اور ان کو خشکی اور تری میں ہم اٹھائے ہیں اور ان کو پاک چیزیں روزی کیں' اور ہم نے ان کو اپنی بہترین مخلوقات پر بزرگی دی۔

اور اسی شرف وامتیاز کی بنا پر آدمؑ بنی آدم کے قائمقام تھے' ان کو بنی آدم کے ساتھ ملا کر صیغہ جمع استعمال فرمایا گیا ہے:

اهبطوا منها جميعا فاما ياتينكم منى هدى فمن تبع هداى فلا خوف عليهم ولاهم يحزنون۔ (بقرہ:۴)

تم سب بہشت سے نیچے اتر جاؤ' اب اگر تم لوگوں کے پاس میری طرف سے کوئی پیغمبرانہ راہنمائی آئے تو جو میری راہنمائی کی پیروی کریں گے تو ان کو نہ کوئی ڈر ہوگا اور نہ وہ غم اٹھائیں گے۔

سورۂ اعراف میں ارشاد الٰہی ہے:

ولقد مكنكم فى الارض و جعلنا لكم فيها معايش قليلا ما تشكرون. ولقد خلقنا كم ثم صورنا كم ثم قلنا للملئكهت اسجدوه لادم فسجدوه الا ابليس ط لم يكن من الساجدين۔ (اعراف:۲)

اور ہم نے زمین میں تم کو قدرت بخشی اور اس میں تمہارے زندگی بسر کرنے کے معاشی طریقے بنائے' تم بہت کم میرے احسان کی قدر کرتے ہو اور ہم نے تم کو وجود بخشا' پھر تمہاری صورتیں بنائیں پھر فرشتوں سے ہم نے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو انہوں نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے نے کہ وہ سجدہ کرنے والوں میں تھا۔

ان آیتوں سے ظاہر ہوا کہ حضرت آدمؑ کو جو عزت اور سرفرازی ملی وہ ان کی وراثت سے تمام بنی آدم کے حصہ میں آئی' اس لیئے حضرت آدمؑ کو زمین کی خلافت کی جو سعادت عطا ہوئی وہ پورے بنی نوع آدم کو نصیب ہوئی' سورہ انعام کے آخر میں ارشاد ہوتا ہے:

وهو الذى جعلكم خلئف فى الارض ورفع بعضكم فوق بعض درجت ليبلو كم فى ما اتكم۔ ان ربك سريع العقاب وانه لغفور رحيم۔ (انعام:۲)

اور وہی (خدا) وہ ہے جس نے تم (انسانوں) کو زمین میں

یا مسلمانوں سے وعدہ فرمایا:

وعد اللہ الذین امنو امنکم و عملوا الصلحت یستخلفھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلکم (نور:۷)

اللہ نے تم میں سے ان سے جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے وعدہ کیا کہ ان کو زمین میں خلافت بخشے گا جس طرح تم سے پہلوں کو خلافت بخشی۔

قرآن پاک کی چار آیتوں میں کچھ قوموں کو دوسری قوموں کا خلیفہ اور جانشین ہونا بیان فرمایا گیا ہے:

وھو الذی جعلکم خلائف الارض (انعام:۱۹)

اور وہ ایسا ہے جس نے تم کو زمین میں جانشین بنایا

سورۂ یونس میں تصریح ہے:

ولقد اھلکنا القرون من قبلکم لما ظلموا وجاء تھم رسلھم بالبینت و ما کانوا لیومنوا کذالک نجزی القوم المجرمین ثم جعلنکم خلائف فی الارض من بعدھم لننظر کیف تعلمون۔ (یونس:۲)

اور تم سے پہلے ہم کئی امتوں کو جب انہوں نے ظلم اختیار کیا ہلاک کر چکے ہیں اور ان کے پاس پیغمبر کھلی نشانیاں لے کر آئے مگر وہ ایسے نہ تھے کہ ایمان لاتے ہم گنہگار لوگوں کو اسی طرح بدلہ دیا کرتے ہیں پھر ہم نے ان کے بعد تم لوگوں کو ملک میں خلیفہ بنایا تا کہ دیکھیں کہ تم کیسے کام کرتے ہو۔

اس کے بعد نوحؑ کی قوم کی تباہی کے بعد ارشاد ہے:

فکذبوہ فنجینہ و من معہ فی الفلک وجعلنھم خلائف (یونس:۸)

لیکن ان لوگوں نے ان (نوح) کی تکذیب کی تو ہم نے ان

(نوح) کو اور جو لوگ ان کے ساتھ کشتی میں سوار تھے سب کو
طوفان سے بچا لیا اور انہیں (زمین میں) خلیفہ بنا دیا۔

سورۂ فاطر میں سارے انسانوں کو خلیفہ اور جانشین فرمایا گیا:

هو الذی جعلکم خلائف فی الارض فمن کفر فعلیه
کفره (فاطر:۴)

وہی تو ہے جس نے تم کو زمین میں (پہلوں کا) جانشین بنایا تو
جس نے کفر کیا اُس کے کفر کا ضرر اسی کو ہے۔

حضرت داوٗدؑ کو خلافت بخشی گئی:

یا دائود انا جعلنٰک خلیفۃ فی الارض فاحکم بین
الناس بالحق (ص:۱)

اے داوٗد! ہم نے تم کو زمین میں جانشین بنایا ہے لوگوں میں
انصاف کے ساتھ فیصلے کیا کرو۔

یہ لفظ خلیفہ خلف سے مشتق ہے جس کے معنی پیچھے کے ہیں اس لیئے ایک کی غیر موجودگی میں خواہ وہ اس کی موت کے سبب سے ہو یا غیبوبت کے سبب سے ہو یا آنکھوں سے بظاہر او جھل ہونے کی صورت میں ہو اس کی طرف سے اس کے پیچھے جو نمائندہ ہو کر آئے وہ اس کا خلیفہ کہلاتا ہے۔قرآن پاک میں ہے:

(۱) فخلف من بعدهم خلف (اعراف و
مریم:۷/۲۱)

تو ان کے بعد ان کے جانشین آئے۔

یہ موت کے بعد کی جانشینی کی صورت ہے دوسری آیت ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے طور پر جاتے وقت حضرت ہارونؑ سے فرمایا:

واخلفنی فی قومی (اعراف:۱۶)

میری قوم میں میرے جانشین یا نائب بنو۔

یہ زندگی میں جانشین کی ایک شکل ہے:

(۲)ولو نشاء لجعلنا منکم ملئکہت فی الارض یخلفون (زخرف:۶۰)

اگر ہم چاہتے تو تم میں سے فرشتوں کو بناتے جو زمین میں خلافت کرتے۔

اوپر کی تین آیتوں میں خلافت کا لفظ ذرا ذرا سے فرق سے تین معنوں میں آیا ہے' پہلی آیت میں ایک کے مرنے کے بعد دوسرے کے آنے کے ہیں' دوسری آیت میں ایک کے کہیں چلے جانے کے بعد دوسرے کے آنے کے ہیں' اور تیسری آیت میں خلافت کے معنی میں مفسرین کا اختلاف ہے' بعض نے کہا کہ اس کے یہ معنی ہیں کہ اگر خدا چاہتا تو تمہاری جگہ فرشتوں کو بناتا جو تمہارے جانشین ہوتے' بعض نے کہا کہ تمہاری جگہ فرشتوں کو زمین پر آباد کر دیتا' اور تیسرا قول یہ ہے کہ تمہاری جگہ فرشتوں کو بناتا جو زمین میں ایک دوسرے کے جانشین چلے جاتے۔

امام راغب اصفہانی نے مفردات میں لکھا ہے کہ اصلی معنی نیابت اور قائمقامی کے ہیں' لیکن اس نیابت اور قائم مقامی کی تین صورتیں ہیں:

الخلافہت النیابہت عن الغیر اما لغیبہت المنوب عنہ واما لموتہت واما لعجزہ واما لتشریف المستخلف (ص ۱۰۰ مصر)

خلافت کے معنی کسی کے نائب ہونے کے ہیں' اب یہ نیابت اصل کی عدم موجودگی کے سبب سے ہو' یا اس کی موت کے سبب سے ہو یا اس کے اپنے منصب سے عاجز ہونے کے سبب سے ہو' یا نائب کو نیابت کی عزت بخشنے کے لیئے ہو۔

پھر امام راغب نے متعدد آیتیں نقل کی ہیں' جن میں یہ تیسرے معنی ان کے نزدیک مناسب ہیں اور یہی معنی اللہ تعالیٰ کی نیابت کے لیئے موزوں ہو سکتے ہیں' مفتی آلوسی صاحب روح المعانی تک ہر آیت پر جس میں یہ لفظ آیا ہے تینوں کے لیئے مختلف قول نقل کیے ہیں اور خود کوئی فیصلہ کن بات نہیں کی ہے جس سے یہ معلوم ہوا

کہ کس آیت میں خلافت کے کون سے معنی لینے چاہئیں' میرے دل میں یہ بات آتی ہے اور روزمرہ کا یہ عام محاورہ بھی ہے کہ جہاں متکلم یہ ظاہر کر دے کہ یہ شخص فلاں کا جانشین ہے وہاں تو اسی فلاں کا جانشین ہونا مقصود ہوگا اور جہاں متکلم اس کی تصریح نہ کرے تو اس سے مقصود خود متکلم کی جانشینی اور قائم مقامی ہوگی' اس اصول پر قرآن پاک ہر اس آیت میں' جس میں اس جانشینی کی تصریح ہے' اس کی جانشینی مراد ہوگی' اور جہاں تصریح نہیں ہے وہاں خود متکلم قرآن یعنی اللہ تعالیٰ کی نیابت اور قائم مقامی ثابت ہوگی' جیسے قرآن پاک میں ایک آیت ہے:

وانفقوا مما جعلکم مستخلفین فیہ (حدید: ۱)

اور خرچ کرو اس (مال) میں سے جس میں تم کو اس نے نائب بنایا۔

اب اس آیت میں ذکر نہیں کہ کس کا نائب بنایا ہے' اس لیے مفسرین دونوں طرف گئے ہیں' کچھ نے کہا ایک کے بعد دوسرے کو اس مال کا نائب بنایا' جیسے باپ کے بعد بیٹا نائب ہوتا ہے کچھ نے کہا کہ مال درحقیقت اللہ تعالیٰ کی **ملک** ہے' اس نے جس کے حوالہ اپنے مال (دولت کو کیا ہے اس کو اپنا امین اور نائب بنایا ہے کہ وہ اس کی طرف سے امور خیر میں اس کو صرف کرے' میں نے جو اصول اوپر پیش کیا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہاں دوسرے معنی صحیح ہیں' کشاف' بیضاوی اور روح المعانی وغیرہ میں بھی اسی معنی کو مقدم رکھا گیا ہے۔ کشاف میں ہے:

ان الاموال التی فی ایدیکم انما ھی اموال اللہ بخلقہ وانشاءہ لھا وانما مولکم ایاھا وخولکم للاستمتاع بھا' وجعلکم خلفاء فی التصرف فیھا۔

وہ مال جو تمہارے قبضے میں ہے (درحقیقت تمہارا نہیں ہے) اللہ تعالیٰ کا ہے' کیونکہ اسی نے اس کو بنایا ہے' اسی نے تمہارے تمتع کے لیے اس کا تم کو مالک بنایا ہے' اور تم کو اس کے تصرف کا اختیار بخشا ہے۔

بیضاوی میں ہے:

من الاموال التی جعلکم اللہ خلفاء فی التصرف فیھا

وہ مال جس کے تصرف میں اللہ تعالیٰ نے تم کو جانشین بنایا ہے۔

روح المانی میں ہے:

جعلکم سجانہت خلفاء عنہ عزوجل فی التصرف فیہ من غیر ان تملکوہ حقیقہت

اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کو اپنا اس (مال) کے تصرف میں جانشین بنایا ہے، نہ یہ کہ تم واقعی اس کے مالک ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ ان مفسرین کی نزدیک اموال کی ملکیت درحقیقت اللہ تعالیٰ کی ہے، اور بنی آدم ان مملوکات کے تصرف میں اللہ تعالیٰ کی اجازت سے اس کے وکیل و نائب ہیں۔

اب ہم اصل آیت کی طرف رجوع کرتے ہیں جو اس باب کا سرعنوان ہے یعنی:

واذقال ربك للملئکہت انی جاعل فی الارض خلیفہت۔ (بقرہ: ۴)

اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں۔

اس آیت کی تفسیر میں مفسرین نے تعمیم کے ساتھ انہی سابقہ دونوں معنوں کو یکے بعد دیگرے لکھ دیا ہے اور کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے طبری میں یہ دونوں قول ہیں، ایک یہ کہ ایک مخلوق کے بعد دوسری مخلوق کی جانشینی کا ذکر ہے، دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنی نیابت کا ذکر فرما رہا ہے۔ حضرت عبداللہؓ بن مسعود اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت سے لکھا ہے:

انی جاعل فی الارض خلیفہت منی یخلفنی فی

الحکم بین خلقی

میں اپنی طرف سے زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں جو میرا خلیفہ ہوگا' میری مخلوقات کے درمیان حکم کرنے میں۔

اس کے اوپر ابن زید کی تفسیر کا مطلب یہ بیان کیا ہے:

ان اللہ تعالی اخبر الملکہت انہ جاعل فی الارض خلیفہت لہ یحکم فیہا بین خلقہ بحکمہ (ص ۱۰۴ مصر)

اللہ تعالیٰ فرشتوں کو خبر دے رہا ہے کہ وہ زمین میں اپنا ایک خلیفہ بنا رہا ہے جو اس کے حکم کے مطابق اس کی مخلوقات میں فیصلہ یا حکومت کرے گا۔

اس سلسلہ میں قاضی بیضاوی کی تصریح زیادہ حکیمانہ ہے:

والمراد بہ آدم علیہ السلام لانہت کان خلیفہت اللہ تعالی فی ارضہ و کذالک کل نبی استخلفہم فی عمارہت الارض و سیاسہت الناس و تکمیل نفوسہم وتنفیذ امرہ فیہم لا حاجہت بہ تعالی الی من ینوبہ بل لقصور رقبضہ وتلقی امرہ بغیر وسط۔

اور اس سے مراد آدم علیہ السلام ہیں' کیونکہ وہ اس کی زمین میں اللہ تعالیٰ کے خلیفہ تھے' اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کو خلیفہ بنایا زمین کی آبادی اور لوگوں کی نگرانی اور نفوس کی تکمیل اور اللہ تعالیٰ کے احکام نافذ کرنے میں اللہ تعالیٰ اس کا محتاج نہیں کہ کوئی اس کا خلیفہ ہو' بلکہ اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی تلقی کسی واسطہ کے بغیر ممکن نہ تھی۔

لیکن قرآن پاک کی آیتوں سے جو ابھی اوپر گزری ہیں اور جن میں اللہ تعالیٰ نے سارے نبی آدم کو خلفاء فرمایا ہے' یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے توسط سے اس خلافت الٰہی کی سند ان کے متبوعین تک کو عطا ہوئی ہے' اور سارے بنی آدم اس شرف سے ممتاز ہیں۔

آیت میں خلافت کی جو تفسیر ابھی بیان ہوئی ہے اس کی ترجیح کے حسب ذیل اسباب ہیں۔

۱۔ تمام مفسرین نے شروع سے اس مطلب کو لکھا ہے۔

۲۔ روایات سے اور قرآن پاک کے اشارات سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں اللہ تعالیٰ ایک مخلوق کے بعد دوسری مخلوق کو پیدا کرتا رہا' اس لحاظ سے آدمؑ کی پیدائش' اللہ کی نیابت' فرشتوں کے سجدہ کرنے اور جنت کے داخلہ' پھر ان کی عدول حکمی اور دنیا میں آباد ہونے اور سلسلہ انبیاء قائم کرنے وغیرہ کے خصوصیات و فضائل جو بیان کیے گئے ہیں۔ ان سے پہلے کی مخلوقات میں کوئی ممتاز نہیں ہوا' یہ اہتمام اس بات کی دلیل ہے کہ نیابت گزشتہ مخلوق کی نہیں' بلکہ خالق کی تھی۔

۳۔ اوپر تفصیل سے تمام آیتوں کو لکھ کر جو اصول مہد کیا گیا ہے' اور جس کا منشا یہ ہے کہ متکلم کے جس کلام میں نیابت کی توضیح مذکور ہوگی' اس میں اسی مذکور کی نیابت سمجھی جائے گی' اور جو کلام اس توضیح سے خالی ہوگا وہاں لامحالہ اسی متکلم کی نیابت مراد ہوگی' جیسے کسی بادشاہ نے کہا کہ میں نے زید کو نائب بنایا' اب اگر کلام میں اس کی توضیح مذکور ہے' یا سیاق و سباق سے مفہوم ہوتا ہے کہ کس کا نائب بنانا مقصود ہے تو اسی کی نیابت سمجھی جائے گی' اور اگر اس توضیح سے کلام کلیتًا خالی ہے تو مقصود خود بادشاہ کا اپنا نائب بنانا ہے' اس اصول پر ظاہر ہے کہ اس آیت میں اور نہ اس سے آگے اور نہ اس کے پیچھے کسی ایسے شخص کی توضیح ہے' جس کا آدمؑ کو نائب بنانا سمجھا جائے' ایسی حالت میں بلاشبہ خود اپنا نائب بنانا مقصود ہو جائے گا۔

۴۔ اس معنی کی تائید میں اور بھی آیتیں ہیں جس سے آدمؑ اور بنی آدم کے شرف و کرامت کا اظہار ہوتا ہے' فرمایا:

ولقد کرمنا بنی ادم وحملنا ھم فی البر والبحر ورزقنا ھم من الطیبات و فضلناھم علی کثیر ممن خلقنا تفضیلا (بنی اسرائیل:۷)

ہم نے آدمؑ کے بیٹوں (بنی آدم) کو عزت بخشی اور ان کو خشکی اور تری میں ہم اٹھائے ہیں، اور ان کو پاک چیزیں روزی کیں، اور ہم نے ان کو اپنی بہترین مخلوقات پر بزرگی دی۔

دوسری آیت میں فرمایا:

ولقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم (تین: ۱)

ہم نے انسان کو بہت اچھی صورت میں پیدا کیا ہے۔

پھر آسمان سے لے کر زمین تک جو کچھ ہے سب اس کے لیئے بنا ہے، اور سب اس کے کام میں لگے ہیں:

وسخر لکم ما فی السموات و ما فی الارض جمیعا منہ ان فی ذالک لایت لقوم یتفکرون (جاثیہ:۲)

اور جتنی چیزیں آسمانوں میں ہیں، اور جتنی چیزیں زمین میں ہیں، ان سب کو اپنی طرف سے مسخر بنایا، بے شک اس میں ان لوگوں کے لیئے دلائل ہیں جو سوچتے ہیں۔

اور یہی نیابت الٰہی کی حقیقت ہے، قرآن میں ایک جگہ نہیں، بیسیوں مقامات میں تمام مخلوقات الٰہی کو انسان کا تابعدار اور مسخر اور اسی کے لیئے ان کا پیدا کیا جانا بہ تفصیل مذکور ہے، مزید تشریح کے لیئے چند آیتیں اور لکھی جاتی ہیں:

وخلق لکم ما فی الارض جمیعا۔ (بقرہ:۳)

اور اس نے جو کچھ زمین میں ہے سب تمہارے لیئے پیدا کیا ہے۔

وھو الذی سخر البحر (نمل:۳)

اور وہی تو ہے جس نے دریا کو (تمہارے) اختیار میں کیا۔

اللہ الذی سخر لکم البحر (جاثیہ:۱)

اللہ ہی تو ہے جس نے دریا کو تمہارے قابو میں کر دیا۔

وسخر لکم الفلک (ابراہیم:۵)

اور کشتیوں (جہازوں) کو تمہارے زیر فرمان کر دیا۔

وسخر لکم الانھار (ابراہیم:۵)

اور نہروں کو بھی تمہارے زیر فرمان کیا۔

ان آیات سے ثابت ہے کہ انسان کائنات کا مقصود اصل ہے اور سی کو ساری مخلوقات کی سرداری بخشی گئی ہے اور یہی خلافت الٰہی کا منشاء ہے ایک اور آیت میں ارشاد ہے:

ان عرضنا الامانۃ علی السموات والارض والجبال فابین ان یحملنھا و اشفقن منھا وحملھا الانسان انہ کان ظلوما جھولا (احزاب:۹)

ہم نے (بار) امانت آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا تو انہوں نے اس کے اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اس کو اٹھا لیا بیشک وہ ظالم اور جاہل تھا۔

اس آیت سے ظاہر ہے کہ ساری مخلوقات میں سے امانت و نیابت الٰہی کے بار کا اٹھانے والا انسان ہی ہے یہ امانت الٰہی کیا ہے؟ یہ اسی نیابت وخلافت کے بیان کا دوسرا پیرایہ ہے نائب حقیقت میں کسی چیز کا مالک نہیں ہوتا بلکہ اصل مالک کی طرف سے صرف ایک وکیل اور امین کی حیثیت رکھتا ہے اس لیئے انسان کے پاس جو کچھ ہے وہ صرف مالک کی امانت ہے جو اس کو ملی ہے تا کہ نیابت کے فرض سے عہدہ برآ ہو سکے اس کا علم اور اس کے دوسرے کمالات ومحاسن و اوصاف سب اللہ تعالیٰ کی طرف راجع ہیں اور اسی کے خزانے سے اس کو چند روز کے لیئے عاریت ملے ہیں یہ حدیث کہ فان اللہ ادم علی صورتہ۔ (اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کو اپنی صورت پر پیدا کیا ہے (اسی معنی کی طرف مشیر ہے اور مشہور قول تخلقو ابا خلاق اللہ (اللہ کے اخلاق سے متصف ہو) کی تشریح بھی یہی ہے۔

اس تفصیل سے واضح ہوگا کہ اسلام کا نظریہ سلطنت و ریاست ایک ایسے تصور پر مبنی

ہے' جو انسانیت کو بلند سے بلند نقطۂ تک پہنچاتا ہے' اور جس کے اندر مادی اور روحانی سیاسی اور اخلاقی' دنیاوی اور دینی دونوں تصورات باہم دست و گریبان ہیں۔

اب اس کا دوسرا رخ یہ ہے کہ خلق عالم کا مقصود اور مخلوقات کا سردار اپنے اصل مالک کے سامنے اپنی بندگی اور عبودیت اور غلامی کا اقرار کرے' قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے انسان کی پیدائش کی غرض بتادی ہے وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون (میں نے انسان اور جن کو اسی لیئے بنایا کہ وہ میری بندگی کریں) اس کی حیثیت اس ایجنٹ کی ہے جس کا فرض صرف اپنے مالک کے احکام کی تنفیذ ہے' اس کے ہاتھ میں شریعت الٰہی کا فرمان ہے' اس کے احکام کو خود بجالانا اور ساری دنیا کو اس کے بجا لانے پر آمادہ کرنا اس کا سب سے بڑا فرض ہے' وہ صرف اپنے مالک کی مرضی کا تابع اور اس کے حکم کا بندہ ہے۔

# امت مسلمہ کی بعثت

عقیدۂ خلافت کی رو سے اگرچہ سارے بنی آدم اس نیابت الٰہی کے شرف کے مستحق ہیں، مگر اہل سعادت وہی ہیں جو اس کو مانتے، اپنے کو اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کا ذمہ دار جانتے اور نیابت کی بلندی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی بندگی اور سرافگندگی کو تسلیم کرتے ہیں، اس نیابت اور عبدیت کے اصل نمائندے تو انبیاء علیہم السلام ہیں، مگر ان کی تبعیت میں ان کی امتیں بھی شامل رہی ہیں، لیکن اب جبکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قیامت تک کے لیئے خاتم الانبیاء ہو کر تشریف لائے ہیں اور آپ کے بعد اب کوئی دوسرا نبی قیامت تک آنے والا نہیں ہے، تو امت محمدیہ ﷺ بھی اپنے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی تبعیت میں نیابت الٰہی کی نمائندہ ہے اور دنیا کی آخری امت کی حیثیت سے قیامت تک نمائندہ رہے گی، اسی لیئے قرآن پاک اور احادیث نبوی ﷺ میں اس کا لقب خاتم الامم اور آخر الامم ہے، قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے امت محمدیہ کو آخرین کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے جس کے معنی پچھلوں کے ہیں:

ثلہت من الاولین وثلہت من الاخرین (واقعہ: ۱)
ایک چھوٹا گروہ اگلوں میں اور ایک چھوٹا گروہ پچھلوں میں سے۔

و اخرین منہم لما یلحقوا بہم (جمعہ: ۱)
اور ان سے پچھلوں میں جو ابھی تک ان میں شامل نہیں ہوئے

اس سے معلوم ہوا کہ امت محمدیہ کے بعد کوئی نئی امت پیدا نہ ہوگی کہ کوئی نیا نبی اب قیامت تک آنے والا نہیں ہے، احادیث میں بھی اس کی تصریحات موجود ہیں صحیح بخاری میں ہے کہ انبیاء کی ان امتوں کی مثال مزدوری کی ہے، اللہ تعالیٰ نے پہلے یہود کو مزدوری پر رکھا تو انہوں نے ظہر تک کام کیا، پھر چھوڑ دیا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ

ابھی تو دن باقی ہے' مگر وہ نہ مانے' پھر نصاری کو مزدور مقرر کیا' انہوں نے عصر تک مزدوری کر کے کام چھوڑ دیا' اللہ تعالی نے فرمایا ابھی تو دن باقی ہے' مگر وہ کام کرنے پر آمادہ نہ ہوئے' عصر کے بعد مسلمانوں کو مزدوری کو شرف بخشا تو انہوں نے مغرب تک کام کر کے انجام تک پہنا دیا اور پوری مزدوری پائی (ملخص) یہ حدیث بعض الفاظ کے اختلاف کے ساتھ بخاری وترمذی وموطا وحاکم وغیرہ حدیث کی کئی کتابوں میں ہے۔( کنز ۶۔۲۳۰)

اس حدیث میں دن سے مراد زمانہ ہے' اس سے واضح ہے کہ امت مسلمہ دنیا کی آخرین امت ہے۔(۱)۔بخاری ومسلم ونسائی میں اوپر کی حدیث کی یہ شرح ہے:

نحن الاخرون السابقون

ہم ہیں سب سے پچھلے لوگ اور سب سے اگلے۔

(۱)۔ صحیح بخاری' کتاب التعبیر۔

یعنی ظہور کے لحاظ سے تو دنیا کی تمام امتوں میں ہم سب سے پیچھے ہیں' لیکن اجر و ثواب میں قیامت کے دن ہم سب کے آگے ہوں گے' حدیث کا یہ ٹکڑا مستدرک حاکم' بیہقی اور نسائی میں بھی ہے ( کنز:۶۔۲۳۰)

ابن ماجہ میں ہے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

نحن اخرا لامم (کنز:۶۔ ۲۳۰)

ہم سب سے آخری امت ہیں۔

غرض ان آیات اور احادیث سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ امت محمد یہ دنیا کی آخری امت ہے کیونکہ وہ آخری نبی کی امت ہے۔

اس امت کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ چونکہ آخری امت ہے اور نبوت کی آخری امانت کی حامل ہے اس لیئے قیامت تک اس میں اہل حق کا ایک گروہ ہمیشہ غالب ومنصور رہے گا' جو دنیا پر اللہ تعالی کی شہادت کی مہر لگاتا رہے گا اور اہل عذر کی حجت کا قاطع ہوگا۔

اس خصوصیت کا ثبوت قرآن پاک اور احادیث میں تصریح کے ساتھ ملتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ قرآن پاک قیامت تک محفوظ رہے گا' اب ظاہر ہے کہ اس کی حفاظت کرنے والے مسلمان ہی ہوں گے' اللہ تعالیٰ کسی بات کا وعدہ فرماتا ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ وسائط اور تدابیر کے بغیر ہی اس کو پورا کردے گا' گو اس کی قدرت کی وسعت میں سب کچھ ہے مگر عالم تدبیر میں اس نے اپنے موعودات کے لئے اسباب وعلل کا واسطہ رکھا ہے' اللہ تعالیٰ نے بندوں کی روزی کا وعدہ فرمایا ہے' مگر اس کا حصول اسباب اور تدابیر پر موقوف رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے خلافت کا وعدہ فرمایا ہے تو اس کا حصول بھی مجاہدات پر موقوف رکھا' اس کے بعد پورا فرمایا' اسی طرح اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کی حفاظت کا جو وعدہ فرمایا ہے' تو وہ بھی اسباب وتدابیر کے ذریعہ ہی پورا ہوگا' اسی لیئے قرآن پاک کی بقائے دوام کے لیئے حاملین قرآن کو بھی تا قیامت دوام بخشے گا اور انہی کے ہاتھوں اور انہی کے سینوں میں محفوظ رکھ کر اس وعدہ کو پورا فرمائے گا' اور یہ وعدہ بھی اسی وقت اپنے اصلی معنوں میں پورا ہوگا جب امت محمدیہ کا ایک گروہ غلبہ اور سطوت کے ساتھ دنیا میں قائم رہے' ارشاد الٰہی ہے:

وممن خلقنا امۃ یھدون بالحق وبہ یعدلون (انعام)

ہمارے مخلوق بندوں سے ایک امت ہے جو حق کی راہ دکھاتی اور حق کا انصاف کرتی ہے (اور کرتی رہے گی)

اہل تفسیر نے اس کو امت محمدیہ کے حق میں سمجھا ہے اور ظاہر کیا ہے کہ یہ حال و مستقبل دونوں کے لیئے ہے' یعنی قیامت تک امت محمدیہ کا ایک گروہ حق کے ساتھ قائم رہے گا۔(۱)

قرآن پاک میں حضرت عیسٰی علیہ السلام کو خطاب کرکے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وجاعل الذی اتبعوک فوق الذین کفروا الی یوم

القیامہت (آل عمران)

اور تمہارے پیروؤں کو تمہارے نہ ماننے ولوں پر قیامت تک غالب رکھوں گا۔

(۱)۔ تفسیر خازن' تفسیر آیت مذکور۔

حضرت عیسٰی علیہ السلام کے اصلی منکر تو یہود ہیں' گو دوسرے کفار بھی تبعًا اس میں داخل ہیں' اسی طرح طرح ان کے اصلی پیرو تو مسلمان ہیں' (۱)۔مگر معنی میں یہودیوں کے مقابلہ میں عیسائی بھی پیرو کہے جا سکتے ہیں' گو گمراہ ہوں (۲)۔' بہر حال اس آیت سے ظاہر ہے کہ اہل اسلام کے ساتھ عیسائی بھی قیامت تک قائم رہنے والے ہیں' اور عجب نہیں کہ حق و باطل کے یہ دو حریف قیامت تک باہم کشمکش میں مبتلا رہیں' یہاں تک کہ حضرت عیسی علہ السلام کے نزول سے مسلمانوں کو غلبہ عام حاصل ہو جائے' جیسا کہ نزول مسیح کی حدیثوں کا منشا بھی ہے۔

قرآن پاک کے ان اشارات النص کی تصریح احادیث نبوی میں استفاضہ کے درجہ تک ہے:

لاتزال من امتی امہت قائمہت باسر اللہ لا تضرھم من خذلھم ولا من خالفھم حتی یاتیھم امر اللہ وھم علی ذلک۔ (بخاری' علامات النبوہ)

میری امت کا ایک گروہ خدا کی شریعت کو لے کر قائم رہے گا' اس کے چھوڑنے والے اور اسکے مخالف اس کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے' یہاں تک کہ اللہ تعالی کی بات یعنی قیامت آجائے گی اور وہ اسی پر قائم رہیں گے۔

لا یزال فاس من امتی ظاھرین حتی یاتیھم امر اللہ وھم ظاھرون۔ (بخاری علامات النبوہ)

میری امت کے کچھ لوگ ہمیشہ غالب رہیں گے' یہاں تک کہ خدا کی بات یعنی قیامت آجائے گی۔

لا یزال من امتی قوم ظاھرین علی الناس حتی

یاتیهم امر الله (بخاری، کتاب التوحید)

میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ غالب رہے گا، یہاں تک کہ قیامت آجائے گی۔

لا یزال من امتی امة قائمة بامر الله لا یضرهم من کذبهم ولا من خذلهم حتی یاتی امر الله وهم علی ذلك (بخاری، کتاب التوحید)

میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ احکام الٰہی کو لے کر قائم رہے گا اس کے جھٹلانے والے اور اس کے چھوڑنے والے اس کو کچھ نقصان نہ پہنچا سکیں گے، یہاں تک قیامت آجائے گی۔

لا تزال طائفة من امتی ظاهرین علی الحق لا یضرهم من خذلهم حتی یاتیهم امر الله وهم کذلك (مسلم، کتاب الامارہ)

میری امت کی ایک جماعت ہمیشہ حق پر غلبہ کے ساتھ قائم رہے گی، اس کے مخالف اور اس کے چھوڑنے والے اس کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے، یہاں تک کہ قیامت آجائے گی۔

لن یبرح هذا الدین قائما یقاتل علیه عصابة من المسلمین حتی تقوم الساعة (مسلم، کتاب الامارہ)

یہ دین اسلام ہمیشہ قائم رہے گا اس کے لیئے مسلمانوں کی ایک جماعت ہمیشہ لڑتی رہے گی، یہاں تک قیامت آجائے۔

لا تزال طائفة من امتی یقاتلون علی الحق ظاهرین الی یوم القیامة (مسلم، کتاب الامارہ)

میری امت کا ایک گروہ قیامت تک حق پر لڑتا رہے اور اپنے دشمنوں پر غالب رہے گا۔

لا تزال طائفة من امتی قائمة بامر الله لا

یضرھم من خذلھم او خالفھم حتی یاتی امر اللہ وھم ظاھرون علی الناس (مسلم' کتاب الامارہ)

میری امت میں سے کچھ لوگ ہمیشہ احکام الٰہی کو لے کر قائم رہیں گے' ان کو چھوڑنے والے اور مخالف کچھ نقصان نہ پہنچا سکیں گے' یہاں تک کہ قیامت آجائے گی۔

(۱)۔تفسیر ابن جریر' تفسیر آیت مذکورہ۔ (۲)۔ تفسیر روح المعانی' تفسیر آیت مذکورہ۔

ولا تزال عصابۃ من المسلمین یقاتلون علی الحق ظاھرین علی من ناواھم الی یوم القیامۃ (مسلم' کتاب الامارہ)

مسلمانوں کی ایک جماعت حق پر ہمیشہ لڑتی رہے گی' اور قیامت تک اپنے دشمنوں پر غالب رہے گی۔

لا تزال عصابۃ من امتی یقاتلون علی امر اللہ قاھرین لعدوھم لا یضرھم من خالفھم حتی یاتیھم الساعۃ وھم علی ذلک (مسلم' کتاب الامارہ)

میری امت کی ایک جماعت خدا کی شریعت کے قائم کرنے پر لڑتی اور اپنے دشمنوں کو دباتی رہے گی' اس کے مخالف اس کو نقصان نہ پہنچا سکیں گے' یہاں تک کہ قیامت آجائے' اور وہ اسی غلبہ کی حالت میں رہیں گے۔

یہ حدیثیں صرف صحیحین کی ہیں' حدیث کی دوسری کتابوں میں جیسے مستدرک حاکم' جامع ترمذی' سنن نسائی' ابوداؤد' ابن ماجہ' ابن حبان میں بھی اس معنی کی حدیثیں مذکور ہیں۔ (۱)۔اس سے اندازہ ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہماری تسکین کی خاطر کے لیئے کس شدت اور کس وضاحت کے ساتھ یہ پیشین گوئی فرما دی ہے کہ مسلمانوں کا ایک گروہ اپنے ظاہری و باطنی غلبہ اور قوت کے ساتھ قیامت تک قائم رہے گی تا کہ حق کا پیغام قیامت تک دنیا میں قائم اور باقی رہے' اس کے

صاف معنی یہ ہیں کہ آئندہ کسی جدید نبی کی بعثت نہ ہوگی اور یہ فرض جو پہلے انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ عطا ہوتا تھا وہ ہر دور میں مسلمانوں کی ایک جماعت انجام دے گی' ایک حدیث ہے۔

یعنی امت محمدی کے علماء انبیاء کے وارث ہیں' ظاہر ہے کہ یہ وراثت نبوت کے عہدہ اور منصب میں نہیں ہے کہ یہ خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات اقدس پر ختم ہو گیا' بلکہ نبوت کے فضائل و کمالات وفرائض سے ان کے حسب استعداد ومرتبہ حصہ ملے گا' اور وہ تبلیغ دین' ہدایت خلق' دعوت حق' اقامت دین' امر بالمعروف' نہی عن المنکر' دفع شبہات' ابطال مبطلین اور رد بدعات وغیرہ ہیں۔ اور وہ یہی کام انجام دیں گے۔

علمائے امت کے علاوہ صلحائے امت بھی یہی درجہ رکھتے ہیں' چنانچہ ایک روایت میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ قیامت کے دن جب حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفاعت سے ساری امتوں کے سر سے قیامت کی پہلی مصیبت دور ہوگی تو یہ امتیں بیک زبان امت محمدیہ کے متعلق یہ شہادت دیں گی۔

کادت ھذہ الامۃ ان تکون انبیاء کلھا (مسند طیالسی' ص ۳۵۴' عن ابن عباس و مسند احمد و ابویعلی)

قریب ہے کہ اس امت کے سارے افراد انبیاء کا مرتبہ پائیں۔

ایک حدیث میں اس کی تشریح آئی ہے کہ اس امت کو یہ رتبہ اس طرح حاصل ہوا کہ شہداء علی الامتہ یعنی اپنی اپنی امت پر شاہد ہونے کا مرتبہ جس طرح انبیائے کرام صلوات اللہ علیہم کو حاصل ہوا اسی طرح اس امت کو شہداء علی الناس کا مرتبہ عنایت ہوا ہے' صحیح احادیث میں ہے کہ قیامت کے دن ساری امتوں پر شہادت کا کام امت

(۱)۔دیکھیے کنزالعمال ج ۶' ص ۲۳۱' ۲۳۵۔ (۲)۔ یہ حدیث

حاضر ہونا یا حاضر رہنا مختلف اغراض سے ہوسکتا ہے' مثلاً اس کی حمایت اور مدد کے لیئے' اس کی ہر حالت اور کیفیت سے باخبر رہنے کے لیے اس کی دیکھ بھال اور نگرانی کے لیئے اس کے متعلق کسی واقعہ کی گواہی اور اس سے دعویٰ کی تائید کے لیئے اس کو امور خیر کی تعلیم اور شر سے بچانے کے لیئے' اسی لیئے لغت کے اصول سے لفظ شہید اور شاہد ان ثانوی معنوں میں حسب سیاق وسباق بولا جاتا ہے' جس کا اندازہ' حسب ذیل آیتوں سے ہوگا:

ا۔حمایتی اور مددگار کے معنی ہیں:

و ادعوا شهداء كم من دون الله۔ (بقرہ:۳)

اور اللہ کے سوا اپنے حمایتیوں کو بلاؤ ( کہ قرآن کا جواب لائیں)

اس معنی کی تائید ایک دوسری آیت سے ہوتی ہے:

ولو كان بعضهم لبعض ظهيرا۔ (بنی اسرائیل:۱۰)

اگرچہ (اس قرآن کے جواب لانے میں) یہ لوگ ایک دوسرے کے مددگار ہوں۔

۲۔گواہ اور دعویٰ کی تائید کرنے والے کے معنی ہیں:

ان الله على كل شى شهيد (حج:۲)

اللہ ہر چیز سے باخبر ہے۔

---

(۱)۔حافظ ابن کثیر نے قرآن کے دوسرے پارہ میں لتکونوا شهداء على الناس کی تفسیر میں ان روایتوں کو یکجا کر دیا ہے۔

ان معنی کی آیتیں قرآن پاک میں کئی ہیں۔

۳۔کسی کی دیکھ بھال اور نگرانی کرنے والے کے معنی میں:

و كنت عليهم شهيد ا مادمت فيهم (مائدہ:۱۲)

(حضرت عیسیٰؑ فرماتے ہیں) میں اپنی امت پر' جب تک ان میں رہا' نگران رہا۔

۴۔ گواہ اور دعویٰ کی تائید کرنے والے کے معنی میں:

فکیف اذا جئنا من کل امت بشہید وجئنا بک علی ھولاء شہیدا۔ (نساء: ۴۱)

بھلا اس دن کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت میں سے گواہ کو بلائیں گے اور تم کو ان لوگوں کا (حال بتانے کو) گواہ طلب کریں گے۔

۵۔ امور خیر کی تعلیم یا امر بالمعروف ونہی عن المنکر کرنے والے کے معنی ہیں:

و کذلک جعلنا کم امت وسطا لتکونوا شہداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شہیدا (بقرہ:۱۴۳)

اور اسی طرح تم کو معتدل امت بنایا تاکہ تم لوگوں کے بتانے والے ہو اور یہ رسول تمہارا بتانے والا ہو۔

اسی معنی کی تائید قرآن کی دوسری آیت سے ہوتی ہے:

کنتم خیر امت آخرجت للناس تامرون بالمعروف و تنہون عن المنکر۔ (آل عمران:۱۱۰)

قوموں کی راہنمائی کو جتنی امتیں ہوئیں ان سب میں تم بہتر ہو اچھی باتوں کو بتاتے ہو اور بری باتوں سے روکتے ہو۔

اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ امت محمدیہ جو آخری امت ہے' اس لیئے مبعوث کی گئی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی آخری شاہد کے طور پر اس دنیا میں پیغمبروں کے کاموں کو انجام دے' وہ نبی کے دعویٰ کی شاہد' حمایتی مددگار اور گواہ ہے وہ دنیا کی ساری قوموں کی نگران کار بنا کر بھیجی گئی ہے' اس کا فرض ہے کہ وہ قیامت تک قوموں میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض انجام دے' اب نبیوں کا سلسلہ منقطع ہو گیا کہ دین الٰہی کامل ہو چکا پیغام الٰہی کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے لے لی ہے' اور اس کی تبلیغ اور اشاعت کا فرض امت محمدیہ کے سپرد ہو گیا ہے' اب یہ تنہا اس کے ذمہ ہے کہ قیامت تک تمام دنیا میں کلمہ الٰہی کی بلندی' حق کی اشاعت' دین کی تبلیغ' نظام

عدل کی برقراری اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرائض انجام دے، رسول پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام اس کے امام و پیشوا ہیں اور وہ خود ساری امتوں کی پیشوا و امام ہے، اور اس کا فرض ہے کہ وہ ان کی امامت اور پیشوائی کرے، چنانچہ قیامت کے دن کی یہی فضیلت تمام انبیاء کی امتوں پر شہادت کی صورت میں ظاہر ہوگی، جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے:

> ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے دن حضرت نوحؑ بلائے جائیں گے، وہ حاضر ہوں گے تو اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تم نے اپنی امت کو تبلیغ کی تھی؟ وہ عرض کریں گے ہاں! میرے رب، پھر اللہ تعالیٰ ان کی امت سے پوچھے گا کہ کیا انہوں نے تم کو تبلیغ کی، وہ انکار کریں گے کہ ہمیں تو کوئی ڈر سنانے والا نہیں آیا، تب اللہ تعالیٰ نوحؑ سے پوچھے گا، تمہارے دعویٰ کی شہادت کون دیتا ہے؟ وہ عرض کریں گے محمد ﷺ اور ان کی امت، تو یہ نوحؑ کی شہادت دیں گے، یہ ارشاد فرما کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ آیت پڑھی وکذلک جعلنا کم امۃ وسطا۔ الخ (یعنی تم کو معتدل و عادل امت بنایا، تا کہ تم لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو) (صحیح بخاری تفسیر سورۂ بقرہ)''

حافظ ابن کثیرؒ نے اس آیت کی تفسیر میں مسند احمد و مستدرک حاکم وغیرہ سے اور متعدد حدیثیں نقل کی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کا نام یہاں مثالاً ہے، ورنہ امت محمدیہ کی یہ شہادت دنیا کی ساری امتوں پر ہوگی، اس کا سبب ظاہر ہے کہ دنیا میں یہی ایک امت ہے جو تمام انبیاء علیہم السلام اور ان کی کتابوں کی صداقت کی شاہد ہے، اس شہادت کے بغیر کوئی شخص اس امت میں داخل ہی نہیں ہو سکتا، کیونکہ یہ ان کے ایمان کا جز ہے، یہی ایمان جو شہادت کے ہم معنی ہے، قیامت

میں نبیوں کی صداقت کی تائید میں ان کی امتوں کے مقابلہ میں شہادت کی صورت میں ظاہر ہوگا۔

سورۂ حج میں سورۂ بقرہ کی اس آیت کی مزید تائید ہے:

هوا جتبا كم وما جعل عليكم في الدين من حرج ملهت ابيكم ابراهيم هو سماكم المسلمين من قبل وفي هذا ليكون الرسول شهيدا عليكم وتكونوا شهداء على الناس. (حج۔ آخر)

اسی اللہ نے (اے امت محمدیہ) تم کو (ساری امتوں) میں چنا ہے اور اللہ نے تمہارے دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی' تمہارے باپ ابراہیم کا دین' اسی نے تمہارا نام مسلم پہلے رکھا' اور اس قرآن میں بھی' تا کہ رسول تم پر گواہ ہو اور تم لوگوں پر۔

اوپر کی تین آیتوں میں امت محمدیہ کے تین وصف بیان ہوئے ہیں' امتہت وسطا (عادل ومعتدل امت) خیر امہت (سب سے بہتر امت) ھواجتبا کم۔ (تمکو خدا نے چنا ہے) یہ تینوں وصف اس امت کی برگزیدگی برتری' اور فضیلت پر شاہد ہیں' بلکہ وصف اجتبا کم (تم کو چنا اور برگزیدہ کیا) تو ایسا ہے کہ اس کا اطلاق انبیاء علیہم السلام پر کیا گیا ہے۔

اس امت محمدیہ کی ساری امتوں پر شہادت کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اس امت کے شاہد عادل حضرت محمد رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں' جو قیامت تک کے لیئے آخری نبی بنا کر بھیجے گئے ہیں' اس لیئے دنیا کی ساری امتیں خواہ وہ اپنے کو کسی بھی سابق نبی کی طرف منسوب کریں' وہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت دعوت ہیں حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی زندگی میں دعوت وتبلیغ امت محمدیہ کا فرض قرار پایا' جب تک دنیا آباد ہے' ہر ملک میں' ہر قوم میں' دنیا کے ہر گوشے میں اس پیغام الہٰی کی دعوت وتبلیغ تا بہ قیامت امت محمدیہ کا فریضہ ہے' یہی بعض علمائے محققین

کی اصطلاح میں امت محمدیہ کی بعثت ہے، جس کی تعبیر حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلویؒ نے حسب ذیل فرمائی ہے۔

''تمام انبیاء علیہم السلام میں سب سے بڑا رتبہ اس نبی کا ہے جس کو بعثت کی ایک اور دوسری نوع بھی حاصل ہوتی ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی رضا یہ ہوتی ہے، کہ اس نبی کو لوگوں کے تاریکی سے نکال کر روشنی میں لانے کا ذریعہ بنائے اور اس کی قوم کو ایک ایسی امت بنایا جائے جو دوسری قوموں کی اصلاح کار بن جائے، تو اس نبی کی بعثت اولیٰ اس کی بعثت ثانیہ کو بھی شامل ہو جاتی ہے۔'' (باب حقیقۃ النبوہ)

شاہ صاحب کا منشا یہ ہے کہ نبی کی بعثت اولیٰ اس کی قوم کی اصلاح اور تزکیہ کے بعد اس کو اس نبی کے احکام و تعلیمات و آداب کا سراپا نمونہ بنا دیتی ہے، اور پھر وہ قوم اپنے نبی کا پیغام لے کر جو اس کو پہنچا ہے، دنیا کی دوسری قوموں میں پھیل جاتی ہے اور اس سے دنیا کی دوسری قومیں ہدایت پا کر اور قوموں کی طرف مبعوث ہوتی ہیں، اور اسی طرح یہ سلسلہ قیامت تک جاری رہے گا۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ نبی کی بعثت اولیٰ کی خبر تو اس آیت میں ہے:

هو الذی بعث فی الامیین رسولا منهم (جمعه: ۱)

وہی ہے جس نے ان پڑھوں میں ایک رسول ان ہی کے اندر سے بھیجا۔

اور امت کی بعثت کا بیان اس آیت میں ہے:

کنتم خیر امہت اخرجت للناس۔ (آل عمران: ۱۲)

قوموں کی راہنمائی کو جتنی امتیں ہوئیں، ان سب میں تم بہتر ہو۔

اور حدیث صحیح میں اس بعثت کی تصریح ان الفاظ میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ

وسلم نے صحابہؓ سے فرمایا:

فانما بعثتم میسرین ولم تبعثوا معسرین۔

تم لوگ آسانی پیدا کرنے والے بنا کر بھیجے گئے اور دشواری پیدا کرنے والے بنا کر نہیں بھیجے گئے ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ امت محمدیہ ایک پیغام حق کی حامل ہے اور اپنے رسول کی طرف سے دعوت و تبلیغ پر مامور ہے وہ اس لیئے مبعوث کی گئی ہے کہ وہ دنیا کی دوسری قوموں کی اصلاح و تزکیہ کی خدمت دے اور اپنے نبی کے پیغام کو دنیا کے گوشہ گوشہ میں پھیلائے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حجتہ الوداع میں آخیر حکم:

فیبلغ الشاھد الغائب۔

(میرے پیغام کو جو یہاں موجود ہے وہ اس تک پہنچادے جو یہاں موجود نہیں)

صرف حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد مبارک تک کے لیئے محدود نہیں، بلکہ قیامت تک کے لیئے یہ جاری و ساری ہے فرمایا گیا کہ ہر حاضر دوسرے غیر حاضر کو اسی طرح پہنچاتا چلا جائے ذیل کی آیت پاک کا بھی یہی منشا ہے:

فلو لا نفر من کل فرقۃ منھم طائفۃ لیتفقھوا فی الدین ولینذروا قومھم اذا رجعوا الیھم لعلھم یحذرون۔ (توبہ:۱۵)

تو یوں کیوں نہ کیا کہ ہر ایک جماعت میں سے چند اشخاص نکل جاتے تا کہ (دین کا علم سیکھتے اور اس میں سمجھ پیدا کرتے اور جب اپنی قوم کی طرف واپس آتے تو ان کو ڈر سناتے تا کہ وہ حذر کرتے۔

داعیوں کی بعثت قیامت تک یوں ہی قائم رہے گی۔

اور یہی منشا اس آیت کا بھی ہے جو پہلے بھی گزر چکی ہے جیسا کہ شاہ صاحب نے فرمایا ہے:

کنتم خیر امہت اخرجت للناس تامرون بالمعرف وتنھون عن المنکر وتومنون باللہ۔ (آل عمران:۱۱۲)

قوموں کی رہنمائی کو جتنی امتیں ہوئیں ان سب میں تم بہتر ہو' اچھی باتوں کو بتاتے ہو' اور بری باتوں سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

لیکن اس سے معلوم ہوا کہ امت کا یہ شرف اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ وہ امر بالمعروف اور نہی المنکر کے فریضہ کو ترک نہ کرے اور ایمان باللہ سے محروم نہ ہو جائے بلکہ ایمان باللہ سے معمور ہو کر خیر کی اشاعت اور شر کی ممانعت کے لیئے سرفروشی کرے' اور اسی لیئے اس سے چند آیت پہلے یہ حکم بھی وارد ہے:

ولتکن منکم امہت یدعون الی الخیر و یامرون بالمعروف و ینھون عن المنکر و اولئک ھم المفلحون۔ (آل عمران:۱۱۱)

اور تم میں ایک جماعت ایسی ہونی چاہئے جو لوگوں کو نیکی کی طرف بلائے اور اچھے کام کرنے کا حکم دے اور برے کاموں سے منع کرے اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

اس سے ظاہر ہوا کہ امت محمدیہ کی فلاح اس امر معروف اور نہی منکر اور دعوت وتبلیغ میں مضمر تھی' جس سے ہر دور میں نئی نئی قومیں اسلام کی آغوش میں اپنا نیا خون لے کر آئیں اور اسلام کی صورت وشوکت کو مسلسل قیام و بقا بخشتی رہیں' لیکن جب سے مسلمانوں نے امت کو قوم کے معنی میں سمجھ لیا' امت بانجھ ہوگئی اور دوسری قوموں کا داخلہ اس میں بند ہو گیا' مگر انشاءاللہ یہ وعدۂ الٰہی پورا ہو کر رہے گا کہ اگر ایک قوم اپنے فرض سے غافل رہے گی تو دوسری قوم آ کر اس فرض کو ادا کرے گی۔

الا تنفروا یعذبکم عذابا الیما ویستبدل قوما غیر کم ولا تضروہ شیئا۔ (توبہ:۶)

اگر تم نکلو تو خدا تم کو بڑی تکلیف کا عذاب دے گا اور تمہاری

جگہ اور لوگوں کو پیدا کر دے گا (جو خدا کے پورے فرمانبردار ہوں گے) اور تم اس کو کچھ نقصان نہ پہنچا سکو گے۔

پھر فرمایا:

یاایھا الذین امنوا من یرتد منکم عن دینہ فسوف یاتی اللہ بقوم یحبھم ویحبونہ اذلہ علی المئومنین واعزہ علی الکفرین یجاھدون فی سبیل اللہ ولا یخافون لومہ لائم ذلک فضل اللہ یئوتیہ من یشاء۔ (مائدہ:۸)

اے ایمان والو! اگر کوئی تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے گا تو خدا ایسے لوگ پیدا کر دے گا جن کو وہ دوست رکھے اور جسے وہ دوست رکھیں اور جو مومنوں کے حق میں نرمی کریں اور کافروں سے سختی سے پیش آئیں خدا کی راہ میں جہاد کریں اور کسی ملامت کرنے والے سے نہ ڈریں، یہ خدا کا فضل ہے، وہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے۔

معلوم ہوا کہ نئی جگہ لینے والی قوم کی صفتیں یہ ہوں گی، اللہ تعالیٰ سے محبت رکھے گی، اپنے دینی بھائیوں کے ساتھ نیک سلوک کرے گی، کفار کے مقابلہ میں سخت ہوگی، اللہ کی راہ میں جہاد کے لیئے ہمیشہ آمادہ رہے گی، اظہار حق میں کسی ملامت کی پرواہ نہ کرے گی۔

اس بعثت سے مشرف اور قوموں کی شاہد بن کر آنے والی امت کے آثار اور فرائض کی پوری تفصیل سورۂ حج کی آخری آیتوں میں ہے:

یاایھاالذین امنوا ارکعوا و اسجدوا و اعبدوا ربکم و افعلوا الخیر لعلکم تفلحون. و جاھدوا فی اللہ حق جھادہ ھو اجتبکم وما جعل علیکم فی الدین من حرج ملۃ ابیکم ابراھیم ھو سمکم المسلمین من قبل وفی ھذا لیکون الرسول شھیدا علیکم

# قوت عاملہ یا قوت آمرہ

کسی جماعت کو منظم جماعت بنانے اور اس کی حفاظت کے لیئے کسی قانون کو چلانے اور پھیلانے کے لیئے ایک قوت عاملہ یا قوت آمرہ کی ضرورت فطرت انسانی کا تقاضا ہے' اسی لیئے جب سے انسانیت کی تاریخ معلوم ہے کوئی ایسی جماعت نہیں بتائی جاسکتی جو کسی سردار کے بغیر وجود میں آئی ہو' انسانی گروہ جب محض ایک خاندان تھا تو خاندان کا بڑا اس کا سردار تھا' اور اس کی زبان کا ہر حکم قانون تھا' جب خاندان نے جماعت کا روپ بھرا تو جماعت کا چودھری اس کا حاکم و آمر بنا' پھر جماعت نے آگے بڑھ کر قوم کی صورت اختیار کی' تو بادشاہوں اور راجاؤں نے جنم لیا' ان بادشاہوں اور راجاؤں نے اس عزت اور شرف کو اپنی خدمت گزاری کا صلہ سمجھنے کے لیئے اپنے غرور استکبار سے اپنا خاندانی حق سمجھا یا مافوق بشر قوی سے اپنے کو متصف قرار دیا اس خیال کا لازمی نتیجہ تھا کہ انہوں نے اپنے کو دیوتاؤں کی اولاد ظاہر کیا' جن کی پوجا ان کی رعایا پر فرض تھی' ان میں سے کوئی سورج بنسی بنا اور کوئی چندر بنسی' یعنی کوئی سورج دیوتا کا نور نظر تھا اور کوئی چاند کا ٹکڑا' اور دیوتاؤں کے اوتار اور قوت ربانی کے اوتار تو سب ہی تھے۔

عراق کے نمرود جبار بن گئے تھے' اور مصر کے فرعون اپنے کو رع یعنی سورج دیوتا کے اوتار کہتے تھے ان ہی میں ایک فرعون وہ تھا جس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں انا ربکم الاعلیٰ (میں ہوں تمہارا سب سے بڑا دیوتا) بننے کا دعویٰ کیا تھا' چین کے بادشاہ اپنے کو خدا کا بیٹا کہتے تھے' اسی لیئے ایرانیوں نے اپنی زبان میں ان کو بغپور (خدا کا بیٹا) اور عربوں نے ابن معاء السماء (آسمان کے نطفہ کا پیدا) کا خطاب دے رکھا تھا' یونان کی قدیم تاریخ بھی ایسے بادشاہوں سے خالی نہیں جو اپنے کو خدا کا اوتار کہتے تھے' ہومر کے بادشاہ (مونارک) دیوتاؤں کی اولاد تھے اور ان ہی سے یونان کے سلاطین پیدا ہوئے۔ (۱)۔ اس روشنی کے زمانہ میں بھی اس

زمین میں جو سورج کا مطلع کہلاتی ہے' یعنی جاپان میں یہ اندھیرا چھایا ہے کہ وہاں کا بادشاہ جاپانی قوم کا خدا ہے جس کی وہ پوجا کرتی ہے۔

روما کا بانی رومس اور اس کا بھائی دونوں ستارۂ مریخ کی اولاد تھے۔ (۲)۔ ولادت مسیح کے پہلے سے سلاطین روما عوام کی نگاہوں میں دیوتا سمجھے جاتے تھے' اور ان کی پرستش کی جاتی تھی۔ (۳)۔ یہودیوں میں حضرت داؤد علیہ السلام سے پہلے قاضیوں کی حکومت تھی جو خدا کے کاہن اور خدا سے الہام پا کر خدا کے نام پر حکومت کرتے تھے' اس کے بعد زمانہ کی گردش اور حالات کے تقاضے سے مختلف قسم کی حکومتیں دنیا میں قائم ہوتی رہیں' ان ہی سبب کے پیش نظر ارباب تاریخ اور علمائے سیاست نے حکومت کی متعدد قسمیں قرار دی ہیں' مثلاً اوتاری' شخصی' زعیمی' امرائی' دستوری' جمہوری۔

---

(۱)۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا' طبع یازدھم' مضمون یونان۔ (۲)۔ تاریخ روما' ص ۳' دارالترجمہ حیدرآباد دکن۔ (۳)۔ ایضاً ص ۴۲۹۔

---

۱۔ اوتاری سے مفہوم تھیاکریسی ہے' یعنی وہ حکومت جس میں صاحب حکومت کوئی ایسا شخص ہو جو خود خدا کا مظہر یا اوتار یا نائب بن کر حکومت کرتا ہو اور اس کی رعایا بھی اس کو اسی نظر سے دیکھتی اور اسی عقیدت سے اس کو مانتی ہے۔

۲۔ شخصی وہ حکومت ہے جس میں تنہا ایک شخص صرف اپنی ذاتی طاقت یا خاندانی قوت و اثر سے حکومت کرتا ہو اس کی خواہش اس کا قانون اور اس کی زبان اس کا فرمان ہو' دنیا میں اکبر بادشاہ ایسے ہی گزرے ہیں۔

۳۔ اور اگر ملک کے باوقار اور دولت مند افراد مل کر ملک پر حکمرانی کریں تو یہ امرائی حکومت ہے' جیسی کبھی یونان میں تھی۔

۴۔ اگر کوئی شخص اپنی سیاسی طاقت اور وضع قانون کی قوت کو اپنی قوم کے منتخب افراد کے ہاتھ میں دے کر خود کو صرف ظاہری بادشاہ کی حد تک محدود کر دے تو یہ حکومت

دستوری ہے، جس طرح انگلستان میں ہے کہ وہاں بادشاہ کو کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔

۵۔ زعیمی (آمرانہ) وہ طرز حکومت ہے جس میں کوئی بھی شخص اپنی ذاتی طاقت سے یا کسی جماعت کا رکن اور روح رواں بن کر اس کے نمائندے کی حیثیت سے ملک پر حکمران ہوتا ہے، مثلاً جرمنی میں ہٹلر، اٹلی میں مسولینی، گو وہ بادشاہ نہیں تھے، مگر ان کا حکم بادشاہ کے طور پر مانا جاتا تھا، فرق اتنا تھا کہ یہ کسی خاندان کے نہیں بلکہ جماعت کے نمائندے تھے۔

۶۔ اور اگر ملک کے ہر طبقہ کے افراد مل کر خود اپنے لیئے کسی مدت معینہ کے لیئے اپنا ایک رئیس منتخب کر لیں، جو خاص قواعد کے ماتحت حکومت کرے تو یہ جمہوری ہے، اس کی ایک صورت وہ ہے جو فرانس میں ہے، اور دوسری وہ جو امریکہ میں ہے، فرانس کی جمہوریت کا رئیس اسی طرح کم اختیار رکھتا ہے، جس طرح انگلستان کا بادشاہ کم اختیار رکھتا ہے، انگلستان میں حکومت کی ذمہ داری مجلس کی نگرانی میں وزیر اعظم پر ہوتی ہے اور امریکہ میں وزیروں کا کوئی سلسلہ نہیں ہے، خود رئیس ایک مجلس کی نگرانی میں حکومت کرتا ہے اور رئیس کے مددگار مختلف شعبوں کے سیکرٹری ہوتے ہیں، اسی جمہوریت کی ایک شکل روس کی جمہوریہ اشتراکیہ شورائیہ بھی ہے جو مزدوروں اور کسانوں کی مختلف انجمنوں کی نمائندوں پر مشتمل ہے۔

اوپر کی سطروں میں حکومت کی تقسیم مختلف ملکوں کی حکومتوں کی تاریخ پر اجمالی نظر ڈال کر گئی ہے جس سے اندازہ ہوگا کہ انسانوں نے اپنے سیاسی امراض کے لیئے اب تک علاج کے کون کون سے نسخے اور طریقے استعمال کیے ہیں

اسلام کے طرز حکومت پر جب بھی غور کیا گیا ہے تو اس طرح سے کہ جس زمانہ کے ماحول میں اس پر غور کیا گیا ہے، اسی کے مطابق اس کو ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے، سیاسیین یورپ نے اسلامی خلافت کو مذہبی یا اوتاری حکومت کا خطاب دیا،

پرانے علماء جو شخصی سلطنتوں کے خوگر ہیں اس کو شخصی بتاتے ہیں۔ نئے لوگوں نے انگریزوں کے نمونہ کو دیکھ کر اس کو دستوری بتایا' پھر جب جمہوریتوں پر نظر پڑی تو اس کو جمہوریت کہنے میں تامل نہیں کیا' پچھلی جنگ کے بعد جب اشتراکیت نے پاؤں پھیلائے اس کو اشتراکیہ کہنے کی بھی جرأت کی گئی' اور اس کے بعد جب موجودہ زعیمی حکومت (ڈکٹیٹرشپ) قوت پکڑ رہی ہے اس کو زعیمی حکومت (ڈکٹیٹرشپ) ثابت کرنے کے لیئے میلان پیدا ہو رہا ہے۔

اصل یہ ہے کہ اسلام نے اپنے اولین دور میں عملاً جس طرز کی حکومت قائم کی اور جس قسم کی مثالیں اور تعلیمیں اس نے پیش کیں ان کی روشنی میں اسلامی حکومت کا جو تصور قائم ہوتا ہے' اس میں بیک وقت مذہبی' شخصی' دستوری' جمہوری اور زعیمی حکومتوں کی خصوصیات اور مظاہرے نظر آتے ہیں' اس لیئے اہل نظر اپنے اپنے مذاق کے اعتبار سے اس کی تعبیر کرتے ہیں' حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ ایک ایسا طرز حکومت ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ ظہور میں آیا اور اسلام ہی نے اس کو پیش کیا ہے وہ اوتاری ہے' نہ شخصی ہے' نہ دستوری ہے' نہ جمہوری ہے اور نہ زعیمی ہے بلکہ ایک ایسا طرز حکومت ہے جس میں ان سب کے خصوصیات وفضائل تو یکجا ہیں لیکن وہ ان کے قبائح ومثالب سے خالی ہے اس لیئے وہ دیکھنے والوں کو کبھی خدائی' کبھی شخصی کبھی زعیمی کبھی دستوری اور کبھی جمہوری بلکہ اشتراکی تک نظر آتی ہے' لیکن اگر اس کے اصل رخ سے دیکھئے اور اس کے ایک ایک خط وخال کا جائزہ لیجئے تو اس کی شکل سب سے الگ نظر آئے گی۔

اسلام کی سلطنت تمام تر مذہبی احکام پر قائم ہے مگر اس کا امیر یا خلیفہ نہ خدا ہے' نہ خدا کا اوتار ہے' نہ خدا کا مظہر ہے' نہ خدا سے ہمکلام ہوتا ہے' نہ خدا سے براہ راست احکام پاتا ہے' نہ اس میں کوئی خدائی تقدیس ہے' نہ وہ خدا کی طرف سے مقرر ہوتا ہے' بلکہ وہ انسان ہوتا ہے جس کو مسلمانوں نے اپنی رائے سے یا سابق امیر نے

امت کی سرداری اور خدا کی شریعت کی تنفیذ کے لیئے اس کو منتخب کیا ہے تاہم اسلام کی حکومت کو اس لحاظ سے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ان احکام پر مبنی ہے جو رسول ﷺ کے ذریعہ سے اس کو ملے ہیں' اس کو الٰہی ہی کہا جا سکتا ہے' اور اس بنا پر کہ اسلام کی حکومت میں ارباب شوریٰ اور اہل حل وعقد کا گروہ مانا گیا ہے اور شوریٰ اور باہمی مشورہ کی تاکید ہے' اس کو تسامحا" دستوری کہہ دینا ممکن ہے اور اس سبب سے کہ اس کے خلیفہ کا انتخاب افراد امت کے جانب سے بھی ہوتا ہے اور اس کو حکومت کے حقوق اور فوائد میں امت کے عام افراد سے ایک ذرہ بھی تفوق حاصل نہیں ہوتا' لوگ جمہوری سمجھ سکتے ہیں اور اس خیال سے کہ خلیفہ کے احکام شرعی کی اطاعت امت پر واجب ہے اور وہ امت کے مشوروں کے ماننے پر قطعاً مجبور نہیں' اس کو شخصی کہہ دینا ممکن ہے اور اس نظر سے کہ خلیفہ کے ہر جائز حکم اور صوابدید پر بے چون و چرا عمل کرنا امت کے لیئے ضروری ہے اس کو زعیم یعنی ڈکٹیٹر سمجھا جا سکتا ہے' لیکن ان مختلف جہتوں کی بنا پر ظاہر ہے کہ مغربی اہل سیاست کے بنائے ہوئے نظریات میں سے ایک نظریہ بھی اسلامی طریق حکومت پر پوری طرح صادق نہیں آ سکتا۔

اصل یہ ہے کہ سیاسی مفکرین کی نظر حکومت کی ظاہری اشکال کے گورکھ دھندوں میں پھنس کر رہ گئی اور اسلام کی نظر اس کے اندر کی حقیقت پر ہے' اس کے نزدیک حکومت کی ظاہر شکل یعنی انتخاب کا طریقہ' ارباب شوریٰ کی ترتیب اور تعیین ان کے فرائض وحقوق' ان کے انتخاب' اظہار رائے کے طریقے اور دیگر متعلقہ مسائل اہمیت کے قابل نہیں' اصل چیز حکومت کے امیر و رئیس اور ان کے ارکان وعمال کا تقویٰ ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی ذمہ داری کا قلبی و ایمانی احساس اور اس حقیقت کی تلقین ہے کہ حکومت کا کوئی جز کسی شخصی یا خاندانی ملکیت نہیں' بلکہ وہ خدا کی ملکیت ہے اور اسی کے حکم یا منشائے حکم کا نفاذ حکومت کا فرض ہے اور خدا کے بنائے ہوئے اور تعلیم کیے ہوئے احکام وفرائض میں سب مسلمانوں کی حیثیت یکساں ہے' اور

سب ہی ایک جیسے اس کے بندے اور تابع فرمان ہیں۔

عام سلطنتوں کا اصول یہ ہے کہ وہ سلاطین و حکام اور سلطنت کے عمال کے قول و فعل کو قانون کے سلسلوں سے جکڑ دیتی ہیں کہ وہ حق و عدل کے خلاف نہ کر سکیں' لیکن اسلامی حکومت کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے حکمرانوں اور عاملوں کے دلوں پر اپنا قبضہ بٹھاتی ہے تا کہ تقوٰی اور آخرت کے مواخذہ کے خوف اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت کے جذبہ سے حق اور عدل کے خلاف نہ کر سکیں' عام حکومتیں ہر روز اپنے ہر قانون کی لاچاری اور بے اثری کو دیکھ کر دوسرا قانون بناتی ہیں' پھر تیسرا اور چوتھا قانون' پھر اسی طرح ہر قسم کی برائیوں کی روک تھام کے لیئے مسلسل قانون بناتی رہتی ہیں اور مجرم اس کو اپنی چالاکی اور ہوشیاری سے برابر توڑتے رہتے ہیں اور سلطنت کا مقصود حاصل نہیں ہوتا' اس کے برخلاف اسلام کی سلطنت اگر اصول اسلام کے مطابق ہو تو صرف خدا کا تقوٰی اور آخرت کے مواخذہ کا ڈر ان کے دل کی کجی اور عمل کی ہر برائی کو قطعاً ختم کر دیتا ہے جس کی بے شمار مثالیں عہد نبوت' زمانہ خلافت اور بعض نیک و عادل سلاطین کی سلطنتوں میں ملتی ہیں' لیکن اس کے لیئے ضروری ہے کہ امت میں ایمان اور عمل صالح کی دعوت و تبلیغ برابر جاری رہے' اور مسلسل تعلیم و تربیت اور تبلیغ و دعوت کے ذریعہ اس کو ہمیشہ قائم و باقی رکھا جائے جس طرح آج تمدن اور کلچر کے نام سے یا دوسرے فلسفیانہ یا سیاسی یا اقتصادی نظریات کی بنا پر مختلف ملکوں میں تعلیم و تربیت اور تبلیغ و دعوت دی جا رہی ہے اور اسی کے معیار پر ہر سلطنت میں تعلیم و تربیت کا جداگانہ نظام قائم ہے' اسی طرح اس اسلامی نظام حکومت کی برقراری کے لیئے بھی سب سے پہلے اسلامی نظام تعلیم و تربیت کے اجرا کی حاجت ہے۔

## اسلامی روایات کی دوسری بنیادی اصل

# حاکم حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے

قال اللہ تعالیٰ: ان الحکم الا للہ (یوسف:۸)

حکم کسی کا نہیں، مگر اللہ کا۔

آیت بالا میں ارشاد خداوندی ہے کہ حکم کسی کا نہیں، مگر اللہ کا ہے، اس لیئے اسلام میں حاکم حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے، لیکن احکام الٰہی کی دو قسمیں ہیں، ایک تشریعی، یعنی وہ احکام جو انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ سے شریعت بن کر نازل ہوتے ہیں اور دوسرے تکوینی، یعنی وہ احکام جو فطری حیثیت سے مخلوقات عالم میں ودیعت رکھے گئے ہیں، ان دونوں قسموں کے لحاظ سے صرف اللہ تعالیٰ ہی حاکم ہے اور اسی کا حکم جاری و ساری ہے، دنیا میں ایسے بادشاہ گزرے ہیں جنہوں نے نمرود و فرعون بن کر دعویٰ بادشاہی کیا مگر ان کو بھی تکوینی احکام الٰہی کے آگے سرنگوں ہو کر جان دینی پڑی، اور یہ شبہہ ان سلاطین عالم کو اس لیئے پیش آتا ہے کہ وہ اپنے تشریعی احکام و فرامین کے آگے جب خدا کے بندوں کو مطیع پاتے ہیں تو غرور سے تکوینی احکام کا آمر بھی اپنے کو جاننے لگتے ہیں، اسلام نے شک و شبہہ کے اس رشتہ کو کاٹ ڈالا ہے، اس نے یہ قرار دیا ہے کہ دنیا کے سلاطین نہ تشریعی اختیار رکھتے ہیں اور نہ تکوینی، زمین سے آسمان تک ساری بادشاہی اللہ ہی کی ہے اور امر تکوینی ہو یا تشریعی اس میں اللہ ہی کا فیصلہ ہے، اسی معنی کی قرآن پاک میں کئی آیتیں ہیں:

ان الحکم الا للہ (یوسف:۸)

حکم نہیں، مگر اللہ کا۔

الا لہ الحکم وھو اسرع الحاسبین. (انعام:۷)

ہاں! اسی کے لیئے حکم کرنا ہے اور حساب کرنے والوں میں سب سے تیز ہے۔

لہ الحکم والیہ ترجعون (قصص:۷)

اسی کا حکم کرنا ہے اور اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

امر تکوینی و فطری میں تو انسان کی ناچاری و مجبوری ظاہر ہے' وہ زمین' آسمان' اور خاک و باد و آب و آتش اور جسم و جان میں ایک ذرہ کی کمی بیشی بھی نہیں کرسکتا' نہ اشیاء کے خواص کو بدل سکتا ہے' نہ ان کی صفات میں تغیر کرسکتا ہے' اور نہ ان کے قواعد وقوانین میں ایک ذرہ کی کمی و اضافہ کرسکتا ہے' خدائی احکام کے آگے سب ہی سرافگندہ اور ناچار ہیں حضرت ابراہیمؑ کے عہد میں ایک بادشاہ نے جب خدائی کا دعویٰ کیا تو آپ نے اس کو اسی دلیل سے خاموش کر دیا' فرمایا:

فان اللہ یاتی بالشمس من المشرق فات بھا من المغرب فبھت الذی کفر۔ (بقرہ:۲۴۴)

تو اللہ سورج کو پورب سے نکالتا ہے تو اس کو پچھم سے نکال' تو وہ کافر لاجواب ہوگیا۔

حکومت و سلطنت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے' دنیا میں بھی جو لوگ حاکم کہلاتے ہیں وہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی عطا اور بخشش سے ہوتے ہیں:

اللھم مالک الملک تؤتی الملک من تشاء (آل عمران:۳)

اے اللہ سلطنت کے مالک تو جس کو چاہے سلطنت دے۔

اس لیئے راہ صواب پر وہی ہیں جو اپنے کو اللہ تعالیٰ کے احکام تکوینی کی طرح اس کے احکام تشریعی کے بھی تابع سمجھتے ہیں اور جو یہ جانتے ہیں کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے حکومت اسی لیئے دی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کو دنیا میں اس کی شریعت کے مطابق جاری کریں اس عقیدہ کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ یہ مانا جائے کہ احکام کے اجرا اور قوانین کے وضع کا اصلی حق صرف اللہ تعالیٰ کو ہے' البتہ سے اہل علم اور مجتہدین دین نئے نئے احکام جزئیہ مستنبط کرسکتے ہیں۔

ان احکام الٰہی کی نسبت اس حیثیت سے کہ ان میں عقلی مصلحتیں ہوں اور طبعی نفع وضرر

پر مشتمل ہوں بے شبہہ اہل عقل اپنی عقل وفہم سے فیصلہ کر سکتے ہیں' لیکن شریعت میں احکام مدار صرف اس حیثیت پر نہیں ہے' بلکہ اس سے اہم حیثیت یہ ہے کہ ان میں سے کسی بات کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رضا یا عدم رضا شامل ہے' یا یوں کہیے کہ کسی فعل پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ثواب یا عتاب ترتیب ہوتا ہے' اس کا حال صرف اللہ تعالیٰ کے ارشاد اور رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بیان ہی سے معلوم ہوسکتا ہے' اہل عقل اپنی ناقص عقل سے جو کچھ کہتے ہیں اگر وہ حکم الٰہی کے مطابق نہیں ہے تو گو اس میں کچھ ظاہری مصلحتیں ہوں مگر حقیقی مصلحتوں کے جاننے کے لیئے امر غائب اور مستقبل کا صحیح علم ہونا ضروری ہے اور یہ انسان کے بس سے باہر کی بات ہے اس لیئے حقیقی مصلحتیں اسی حکم میں ہیں جس کو خدائے عالم الغیب نے نازل فرمایا:

۱۔ان الحکم الا للہ (انعام و یوسف:۸)

حکم صرف اللہ کے لیئے ہے۔

۲۔الا لہ الخلق و الامر (اعراف:۷)

ہاں اسی اللہ کے لیئے ہے پیدا کرنا اور حکم دینا۔

یہ دونوں آیتیں جن موقعوں پر وارد ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم اور امر تکوینیات اور حوادث عالم سے متعلق ہے' پہلی آیت دو جگہ ہے' سورۂ انعام اور سورۂ یوسف میں' سورۂ انعام کا موقع یہ کہ کفار نبی کی صداقت کے ثبوت میں عذاب کا جلد مشاہدہ چاہتے تھے' اس کے جواب میں ہے:

ما عندی ما تستعجلون بہ ان الحکم الا للہ یقص الحق وھم خیر الفاصلین (انعام:۷)

جس چیز کا تم تقاضا کر رہے' وہ میرے پاس نہیں ہے حکم کسی کا نہیں بجز اللہ تعالیٰ کے' اللہ تعالیٰ واقعی بات بتلا دیتا ہے اور وہی سب سے اچھا فیصلہ کرنے والا ہے۔

دوسری جگہ سورۂ یوسف میں اس موقع پر ہے جب وہ اپنے بیٹوں کو ہدایت کرتے

ہیں کہ مصر میں مختلف دروازوں سے داخل ہونا کہ کسی آفت میں نہ پھنسو، پھر فرماتے ہیں کہ یہ تو انسانی تدبیر ہے مگر ہوگا وہی جو اللہ کو منظور ہے:

وما اغنی عنکم من اللہ من شیء ان الحکم الا للہ علیہ توکلت وعلیہ فلیتوکل المتوکلون (یوسف:۸)

اور خدا کے حکم کو میں تم سے ٹال نہیں سکتا، حکم تو بس اللہ ہی کا چلتا ہے (باوجود اس تدبیر ظاہری کے دل سے) اس پر بھروسہ رکھتا ہوں اور اسی پر اور بھروسہ رکھنے والوں کو بھروسہ رکھنا چاہئے۔

دوسری آیت کا موقع یہ ہے:

ان ربکم اللہ الذی خلق السموات والارض فی ستۃ ایام ثم استوی علی العرش یغشی اللیل النہار یطلبہ حثیثا والشمس والقمر والنجوم مسخرات بامرہ الا لہ الخلق والامر تبارک اللہ رب العلمین۔ (اعراف:۷)

بے شک تمھارا رب اللہ ہی ہے جس نے سب آسمانوں اور زمین کو چھ روز میں پیدا کیا، پھر عرش پر قائم ہوا، چھپا دیتا ہے شب سے دن کو ایسے طور پر کہ وہ شب اس دن کو جلدی سے لے آتی ہے، اور سورج اور چاند اور دوسرے سیارے کو پیدا کیا ایسے طور پر کہ سب اسی کے حکم کے تابع ہیں، یاد رکھو اللہ ہی کے لیئے خاص ہے خالق ہونا اور حاکم ہونا بڑی خوبیوں کے ساتھ بھرے ہوئے ہیں اللہ تعالیٰ جو تمام عالم کے پروردگا ہیں۔

صاف ظاہر ہے کہ اس امر کا تعلق خلق وتکوین سے ہے، ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ لفظ امر اور حکم کی لغوی وسعت کی بنا پر امور تشریعی کو بھی کسی درجہ میں شامل ہو جائیں، لیکن

قرآن پاک اور احادیث میں جب دوسرے تصریحی دلائل اس دعویٰ پر موجود ہیں تو اس تصریح کو چھوڑ کر اجمالی دلیل پر قناعت کیوں کی جائے۔

## عبادت ::

کے معنی صرف کسی کو معبود بنا کر پکارنے ہی کے نہیں ہیں، بلکہ اگر کسی کو زبان سے معبود نہ بھی کہا جائے اور اس کی ظاہری پرستش نہ بھی کی جائے لیکن اس کے احکام کی مثل خدا کے حکم کی مستقلاً اطاعت کی جائے تو یہ بھی عبادت ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے ادا ہوتا ہے:

لا تعبد الشیطان (مریم:۵)

شیطان کی عبادت نہ کر۔

دوسری جگہ ارشاد الٰہی ہے:

اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم

اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اور اولی الامر کی اطاعت کرو۔

اولوالامر کی اطاعت، خواہ اس سے مراد علماء ہوں یا حکام، خدا کے حکم کے تحت اسی کے احکام کی تنفیذ اور اجرا میں ہے، اور رسول کی اطاعت بھی احکام الٰہی کی تنفیذ ہی کی خاطر ہے، جیسا کہ ارشاد ہے:

ومن یطع الرسول فقد اطاع اللہ (نساء:۸)

اور جو رسول کی اطاعت کرتا ہے، اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

اس سے پہلے اسی سورہ میں ہے:

وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ۔ (نساء:۷)

اور ہم نے کسی رسول کو نہیں بھیجا، لیکن اس لیئے کہ اذن سے اس کی اطاعت کی جائے۔

یہود اور نصاریٰ نے احکام الٰہی کو چھوڑ کر اپنے راہبوں اور کاہنوں اور پوپوں کی اطاعت کو دین بنا رکھا تھا اور ان کا حکم حکم خدا سے ماخوذ و مستنبط بلکہ مستقل حکم کے طور

پر بجالایا جاتا تھا' اس لیئے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ان کو شرک کا ملزم قرار دیا ہے اور ان سے جزیہ لینے یا قتال کرنے کا حکم دیا گیا ہے' ارشاد ہے:

قاتلوا الذین لا یؤمنون باللہ ولا بالیوم الاخر ولا یحرمون ماحرم اللہ ورسولہ ولا یدینون دین الحق من االذین اوتوا الکتاب۔ (توبہ: ۴)

اہل کتاب میں سے ان سے لڑو جو اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتے اور نہ جس کو اللہ اور اس کے رسول نے حرام کیا اس کو حرام مانتے ہیں اور نہ دین حق کی اطاعت کرتے ہیں۔

ان آیات میں اہل کتب پر ایمان نہ رکھنے کا جو الزام قائم کیا گیا ہے وہ اسی لحاظ سے ہے کہ وہ صرف حکم الٰہی کے پابند ہیں' بلکہ یہ مرتبہ انہوں نے خدا کے بندوں کو بھی دے رکھا ہے چنانچہ اس کے بعد اس کی تصریح ہے:

اتخذوا احبارھم و رھبانھم اربابا من دون اللہ والمسیح ابن مریم وما امروا الا لیعبدوا الھا واحدا (توبہ: ۵)

انہوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے عالموں اور راہبوں کو رب بنا رکھا ہے' اور مریم کے بیٹے مسیح کو' حالانکہ ان کو صرف یہ کہا گیا ہے کہ ایک ہی معبود برحق کی عبادت کریں۔

عالموں اور راہبوں کو رب بنانا اسی بنا پر ہے کہ ان کے حکموں کو بھی مستقلاً خدا کا حکم تسلیم کرتے تھے کیونکہ ان عالموں اور راہبوں کو یہ دعویٰ تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کو غیبی طور پر اپنے حکموں اور معاملات کے فیصلوں سے مطلع فرماتا ہے' اسلام نے اہل کتاب کو دوسری سورہ میں اسی شرک سے باز رہنے کی دعوت دی:

یاھل الکتاب تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا وبینکم ان لا نعبد الا اللہ ولا نشرک بہ شیئا ولا یتخذ بعضنا بعضا اربابا من دون اللہ۔ (آل عمران: ۷)

اے کتاب والو! آؤ ایک بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں مانی ہوئی ہے یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کریں اور نہ اس کے ساتھ کسی کو شریک بنائیں اور نہ ہم ایک خدا کو چھوڑ کر دوسرے کو رب بنائیں۔

یہ رب بنانا اطاعت ہی کی بنا پر ہے' ترمذی اور مسند احمد میں ہے کہ جب عدی بن حاتم جو ایک عیسائی عرب امیر تھے' آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ نے ان کے سامنے سورۂ توبہ والی آیت مذکورہ پڑھی تو عدی نے کہا ''وہ ان کو معبود نہیں بناتے' فرمایا کیوں نہیں' انھوں نے ان کے حلال کو حرام اور حرام کو حلال کیا اور انھوں نے ان کے احکام کو مانا' یہی ان کا ان کو معبود بنانا ہے' الفاظ یہ ہیں فذالک عبادتھم ایاھم (۱)۔ترمذی کی روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہاں وہ ان کی عبادت نہیں کرتے تھے' لیکن جب وہ کسی چیز کو حلال کہتے تھے یہ حلال مان لیتے تھے اور جب حرام کہتے تھے تو یہ حرام سمجھ لیتے تھے' یہی تو شرک ہے۔ (۲)۔

(۱)۔ تفسیر ابن کثیر۔ (۲)۔ ترمذی تفسیر آیت توبہ۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ کسی شے کو حلال یا حرام ٹھہرانا کسی انسان کا کام نہیں' بلکہ خدا کا ہے اور اسی کا نام وضع حکم ہے' اس تحلیل وتحریم میں کسی کو شریک ٹھہرانا عین شرک ہے' اسی طرح خدا کے علاوہ یا خدا کے حکم کے ساتھ بلا وساطت حکم خداوندی کسی دوسرے کے حکم کی اطاعت بھی شرک ہے اسی لیئے اللہ تعالیٰ نے ان عرب اور یہود منافقین کو جو قانون الٰہی کی سختی سے بچنے کے لیئے یا ایمان کی کمزوری کے سبب سے اپنے مقدمات یہودیوں کی عدالتوں میں لے جاتے تھے' یا ان کے فیصلہ کے لیئے عرب کاہنوں کے پاس جاتے تھے زجر وتوبیخ فرمائی اور ان کے اس فعل کو کھلا نفاق اور شرک فرمایا چنانچہ بعض اصولی احکام عدل وانصاف اور طریق اطاعت احکام کے ذکر کے بعد ارشاد ہے:

الم تر الی الذین یز عمون انھم اٰمنوا بما انزل الیک وما انزل من قبلک یریدون ان یتحا کموا الی الطاغوت وقد امروا ان یکفروا۔ (نساء:۹)

کیا تو نے ان کو نہیں دیکھا جو گمان کرتے ہیں کہ وہ اس پر جو تیری طرف اتارا گیا اور تجھ سے پہلے اتارا گیا' ایمان لا چکے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ طاغوت کو اپنا حاکم بنائیں حالانکہ ان کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اس کو نہ مانیں۔

طاغوت لغت میں ہر اس شے کو کہتے ہیں جس کو خدا تعالیٰ کو چھوڑ کر معبود بنایا جائے ''کل معبود من دون اللہ اور اہل تفسیر نے شان نزول کا لحاظ کر کے کبھی اس سے کاہنوں' جادوگروں اور کبھی یہودی حاکموں کو مراد لیا ہے' اس لیئے اس کا مشترک مفہوم یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا جس کے احکام کو قانون کا درجہ دے کر اطاعت کی جائے اور اس کے مطابق فیصلہ چاہا جائے' وہ طاغوت ہے قرآن مجید میں یہ لفظ سات جگہوں پر آیا ہے اور ہر جگہ اس سے مراد حاکم باطل اور معبود باطل لیا گیا ہے۔ قوانین الٰہی کو چھوڑ کر کسی اور قانون کے مطابق فیصلہ کرنا اور فیصلہ چاہنا فسق ہے اور اس کا مرتکب فاسق کہلائے گا۔

ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الفاسقون (مائدہ:۷)

اور اللہ نے جو اتارا ہے اس کے رو سے جو فیصلہ نہیں کرتے وہی فاسق ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ان احکام کا دوسرا نام حدود ارشاد فرمایا ہے' حدود وہ نشانات ہیں جہاں تک آگے بڑھنے کی انسان کو اجازت ہے اور جس سے تل بھر آگے جرأت گناہ اور عصیان ہے' اور یہ حدود اللہ تعالیٰ ہی کے بتائے ہوئے ہیں' ان کا نزول اللہ تعالیٰ ہی کے یہاں سے ہوا ہے قرآن پاک میں سورہ بقرہ اور نساء اور طلاق میں احکام الٰہی بعد ارشاد ہے:

تلك حدو دالله (طلاق: ۱)

یہ اللہ کی بنائی ہوئی حدیں ہیں۔

تلك حدو دالله و من یتعد حدو دالله فقد ظلم نفسه (طلاق: ۱)

یہ اللہ کی بنائی ہوئی حدیں ہیں جو ان حدوں سے آگے بڑھے گا، وہ اپنے آپ پر ظلم کرے گا۔

سورۂ نساء میں وصیت کے قواعد کی تفصیل بتا کر آخر میں ارشاد ہوتا ہے:

تلك حدود الله و من یطع الله و رسوله یدخله جنت تجری من تحتها الانهر خالدین فیها و ذالك الفوز العظیم و من یعص الله و رسوله ویعد حدوده یدخله نارا خالدا فیها و له عذاب مهین۔ (نساء: ۲)

یہ اللہ تعالیٰ کی حدیں ہیں، اور جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا ہے، اللہ اس کو جنت میں داخل کرے گا۔ جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، اسی میں ہمیشہ رہیں گے اور یہ بڑی کامیابی ہے اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اور اللہ کی حدوں سے آگے بڑھے گا اس کو وہ دوزخ میں ڈالے گا جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کے لیئے بڑی ذلت کی سزا ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ ان حدود پر عمل اللہ تعالیٰ اور رسول کی اطاعت اور اس کی جزاء جنت کی نعمت ہے اور ان سے انحراف اللہ کی نافرمانی اور اس کا نتیجہ دوزخ کی سزا اور ذلت کی مار ہے اور رسول کی اطاعت درحقیقت اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے۔

قانون وشرع کی حقیقت تحلیل وتحریم ہی ہے اور یہ حق صرف اللہ تعالیٰ کے لیئے مخصوص ہے انسان اگر اپنی طرف سے کسی قانون کو وضع کرلے اور بلا سند الٰہی کسی شے کو حلال یا حرم کرلے تو اس کا نام ''افتراء علی اللہ'' خدا پر جھوٹ تہمت باندھنا ہے،

ارشاد ہوا:

ولا تقولوا بما تصف السنتكم هذا حلال و هذا حرام لتفتروا على الله الكذب ان الذين يفترون على الله الكذب لا يفلحون متاع قليل ولهم عذاب اليم (نحل: ۱۵)

اور جن چیزوں کو تم اپنی زبان سے (حلال وحرام) بتاتے ہو' ان کی نسبت یہ نہ کہو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام' تا کہ تم اللہ پر جھوٹ تہمت لگاؤ' یہ (دنیا میں) چند روزہ فائدہ ہے اور ان کے لیئے دردناک عذاب ہے۔

اس آیت پاک میں نہ صرف یہ کہ اس حلال وحرام شریعت کو اپنے لیئے مخصوص فرمایا یہ بھی پیشین گوئی فرمادی کہ جو لوگ شریعت الٰہی کو چھوڑ کر خود اپنی شریعت بنائیں گے' گو ان کو تھوڑے دن کا فائدہ حاصل ہو جائے گا وہ ان کے لیئے عذاب ہی ثابت ہوگا' دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو شریعت الٰہی کے مظہر تھے اور بندوں کو احکام الٰہی سے آگاہ فرماتے تھے اور اس حیثیت سے آپ ﷺ کا ہر حکم حکم الٰہی ہے' لیکن الٰہی کے بغیر ایک مرتبہ آپ نے ایک چیز کو اپنے لیئے حرام قرار دیا تو عتاب الٰہی آیا:

یایها النبی لم تحرم ما احل الله لك۔ (تحریم: ۱)

اے پیغمبر! تو کیوں اس کو حرام کرتا ہے جس کو اللہ نے تیرے لیئے حلال کیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہ استحقاق نبی کو بھی حاصل نہیں' حالانکہ ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ کسی مباح چیز کا استعمال اپنی کسی ذاتی مصلحت کی بنا پر ترک کردے مگر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسا کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس حق کے استعمال سے آپ ﷺ کو منع فرمادیا' کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو اس سے دو نقصان تھے ایک یہ کہ نبی کا ہر فعل جو اس کے لیئے فعل مخصوص نہ ہو امت کے لیئے حکم الٰہی کے تحت شرع کا حکم

رہتا ہے' اس قاعدہ کی بنا پر آپ ﷺ کے اس ترک سے امت اپنے لیئے بھی ایک حلال چیز کو حرام سمجھ لیتی' دوسرے یہ ثابت ہوتا کہ نبی کو بغیر اذن الٰہی کے بھی حق تشریع ہے' جو صحیح نہ ہوتا' اسی لیئے نبی کی تشریعی حیثیت یہی ہے کہ وہ شریعت الٰہی کا مبلغ اور قانون ربانی کا شارح اور مظہر ہے' قرآن پاک کی اس آیت میں ہے:

ولا یحرمون ماحرم اللہ ورسولہ۔(توبہ: ۴)

اور (یہود و نصاریٰ) اسے حرام نہیں کرتے جس کو اللہ اور اس کے رسول نے حرام کیا ہے۔

اس آیت میں رسول کی طرف جو تحریم کی نسبت ہے وہ اسی حیثیت سے ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے فرمان کے مبلغ تھے' رسول کی اطاعت عین اللہ کی اطاعت ہے' جس طرح احکام میں اولوالامر کی اطاعت عین رسول کی اطاعت ہے کیونکہ وہ رسول ہی کے لائے ہوئے احکام کو پیش کرتے ہیں۔

اسلام میں علوم کی تدوین کے زمانہ میں یہ مسئلہ کہ حاکم شرع اللہ تعالیٰ ہے' اصول کا مسئلہ بن گیا ہے' چنانچہ عقائد اور اصول فقہ کی کتابوں میں اس مسئلہ پر بحثیں موجود ہیں۔

علم اصول فقہ میں یہ مسئلہ اس حیثیت سے زیر بحث آیا ہے کہ واضع قانون صرف اللہ تعالیٰ ہے اور اسی کے امر و نہی سے بندوں نے فرض و واجب اور حرام و حلال کو جانا۔

علامہ آمدی المتوفی ۶۳۱ھ اپنی کتاب الاحکام فی اصول احکام میں لکھتے ہیں:

اعلم انہ لا حاکم سوی اللہ تعالی ولا حکم الا ماحکم بہ' ویتفرع علیہ ان العقل لا یحسن ولا یقبح ولا یوجب شکر المنعم وانہ لاحکم قبل ورد الشرع۔ (مصر: ۱۱۳/۱)

جاننا چاہئے کہ حکم دینے والا اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں اور حکم وہی ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا ہے' اور اسی اصلی مسئلہ پر یہ مسئلہ متفرع ہوتا ہے کہ عقل نہ کسی چیز کو اچھا کہتی ہے نہ

برا' اور یہ کہ محسن کا شکر عقلاً نہیں ہے' اور یہ کہ شرع کے ورود سے پہلے کوئی حکم نہیں۔

مقصود یہ ہے کہ احکام شریعت اور قانون شرعی کا واضع صرف اللہ تعالیٰ ہے' اسی کا حکم حکم ہے اور اسی کا قانون قانون ہے اس بنا پر شرع کے نزول سے پہلے تنہا عقل کے رو سے کوئی حکم فرض' واجب سنت' مستحب یا حرام' ناجائز و مکروہ کی صورت میں جس کے قائل پر ثواب یا عتاب کا حکم عائد کیا جا سکے نہیں ہو سکتا اور نہ عقل اپنی تنہا کوشش سے کسی بات کو بہ اعتبار ثواب یا عذاب کے اچھا یا برا کہہ سکتی ہے' علامہ ابن ہمام حنفی المتوفی ۸۶۱ھ تحریر میں لکھتے ہیں:

الحاکم لا خلاف فی انه رب العالمین (ص: ۸۹۔۲)

اس میں اختلاف نہیں کہ حکم کا واضع پروردگار عالم ہے۔

قاضی بیضاوی المتوفی ۶۱۵ھ کی منہاج الاصول کی شرح میں علامہ اسنوی واضح کرتے ہیں۔

''حسن و قبح اور شے کے اچھے یا برے ہونے کے ایک معنی یہ ہیں کہ اس شے کو فطرت پسند کرتی ہے یا اس سے نفرت رکھتی ہے جیسے ڈوبتوں کو پانی سے باہر نکالنا اچھی بات ہے' اور کسی کا مال ظلم سے لے لینا برا ہے اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ ایک کمال کی صفت ہے اور دوسری نقص کی' جیسے علم اچھا ہے اور جہل برا ہے' ان دونوں معنوں کے لحاظ سے ان کے اچھے یا برے ہونے کا عقل کی رو سے فیصلہ کرنے میں اختلاف نہیں ہے' اختلاف اس میں ہے کہ کسی فعل پر ثواب اور کسی پر عذاب کے ترتب کا فیصلہ صرف شریعت سے معلوم ہو سکتا ہے۔ اشاعرہ (اور عام اہلسنت) کے نزدیک حسن و قبح کے یہ دونوں فیصلے شرع پر موقوف نہیں' اور معتزلہ کہتے ہیں کہ عقل اس کا فیصلہ کر سکتی ہے اور اس فیصلہ کے لیئے حکم الٰہی کے ورود

کا انتظار نہیں کیا جائے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ پر بندوں کے مصالح اور مفاسد کی مراعات (لحاظ کرنا) واجب ہے' شریعت کے نزول سے عقل کا فیصلہ مضبوط اور مستحکم ہو جاتا ہے۔'' (ص ۹۰ بر حاشیہ تحریر ابن ہمام)

معتزلہ نے حقیقت میں الٹی بات کہی ہے' یہ کہ شریعت کے فیصلہ سے حکم کی معرفت ہوتی ہے' اور عقل سے اس کی مصلحت' قیاس' تجربہ کی بنا پر اہل عقل کے نزدیک مضبوط اور مستحکم ہو جاتی ہے اور یہی اہل سنت میں سے متاخرین ماتریدیہ (حنفیہ) کا مسلک حق ہے' مولانا محب اللہ بہاری المتوفی ۱۱۱۹ھ مسلم الثبوت میں لکھتے ہیں:

''حکم صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے' اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ کمال و نقص اور دنیاوی غرض و مصلحت موافق یا مخالف ہونے کا فیصلہ عقل سے ہوتا ہے اختلاف اس میں ہے کہ کسی فعل کے کرنے والے کا اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہ صرف شرع سے معلوم ہوتا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اچھا فرمایا ہے وہ اچھا ہے اور جس کو برا فرمایا وہ برا ہے' اور اگر اللہ تعالیٰ اس کے خلاف فرماتا تو وہی اچھا یا برا ہوتا اور ہمارے (یعنی ماتریدیہ) اور معتزلہ کے نزدیک وہ عقل سے معلوم ہو سکتا ہے' لیکن ماتریدیہ اور معتزلہ میں فرق یہ ہے کہ معتزلہ اور امامیہ اور کرامیہ وغیرہ یہ کہتے ہیں کہ جس پہلو کو عقل ترجیح دے اسی کے مطابق حکم دینا اللہ تعالیٰ پر واجب ہے اور ہمارے نزدیک یہ ہے کہ جس پہلو کو عقل ترجیح دے' وہ پہلو اس بات کا مستحق ہے کہ اللہ حکیم و دانا کا حکم ہے' لیکن جب تک اللہ تعالیٰ حکم نہ دے کوئی حکم محض عقل سے نہیں ہو سکتا۔''

(المقالۃ الثانیہ فی الاحکام)

بعض اہل اصول نے معتزلہ کی طرف جو یہ نسبت کی ہے کہ وہ حاکم قانون عقل کو سمجھتے

ہیں، مولانا بحر العلوم نے شرح مسلم الثبوت میں اسی مسئلہ کی شرح میں اس کی تردید کی ہے، فرماتے ہیں:

''اس مسئلہ پر حکم صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے، تمام امت کا اجماع ہے اور ہمارے مشائخ کی بعض کتابوں میں جو یہ لکھا ہے کہ یہ ہمارے نزدیک ہے اور معتزلہ کے نزدیک واضح قانون (حاکم عقل ہے، یہ غلط ہے کیونکہ ایسا کہنے کی جرأت کسی ایسے شخص کو نہیں ہوسکتی جو مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتا ہو، بلکہ معتزلہ یہ کہتے ہیں عقل بعض احکام کو جان سکتی ہے چاہے شرع اس میں وارد ہو یا نہ ہو اور یہی ہمارے اکابر مشائخ کے نزدیک بھی ثابت ہے۔''

قاضی شوکانی المتوفی ۱۲۲۵ھ کی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ اشاعرہ اور معتزلہ کے اختلاف اور اتفاق کے موقع میں حسب ذیل فرق ہے:

''اس میں کسی کا اختلاف نہیں کہ نبی کی بعثت اور اس کی دعوت کے پہنچنے کے بعد حاکم قانون صرف شرع ہے اختلاف اس زمانہ اور حالت سے متعلق ہے جب نبی کی بعثت نہ ہو، یا اس کی دعوت کسی تک نہ پہنچی ہو تو اشاعرہ کے نزدیک اس وقت کسی حکم کا کوئی مکلّف نہیں ہے، نہ کفر حرام ہے، نہ ایمان واجب ہے اور معتزلہ کے نزدیک اس وقت بھی عقل کے رو سے جو حکم ہو اس کے ساتھ حکم الٰہی کا تعلق سمجھا جائے گا۔'' (ص ۱۶، ارشاد الفحول، مصر)

اب آخر میں ہم حضرت مولانا شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ تعالیٰ کا وہ قول فیصل نقل کرتے ہیں جو ان تمام مباحث کا نچوڑ (خلاصہ) ہے:

''اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی حاکم نہیں، اسی کے لیئے ہے پیدا کرنا اور حکم دینا اور عقل وغیرہ کسی مخلوق کی یہ شان نہیں کہ وہ کسی حکم

کو ثابت کرے' اللہ تعالیٰ نے وجوب یا استحباب کے ساتھ جس کا حکم دیا وہ درحقیقت حسن (اچھا) ہے' عام اس سے کہ وہ لذاتہ حسن ہے یا اپنے کسی وصف یا اپنے کسی متعلق کی بنا پر' اسی طرح جس سے منع فرمایا وہ قبیح (برا) ہے تو افعال کا حسن و قبح کے ساتھ انصاف' امر و نہی سے پہلے ہی عالم حقیقت میں ہو چکا تھا اسی کی رعایت کر کے اللہ تعالیٰ نے امر و نہی فرمایا ہے' عقل کبھی ان کے حسب و قبح کو معلوم کر لیتی ہے' تو اس موقع پر اس حسن و قبح کو عقلی کہہ دیتے ہیں' لیکن شرع کے ورود سے پہلے کوئی حکم نہ تھا یہ مذکورۂ بالا حسن و قبح بندوں کے حق میں صرف شرع الٰہی پر مبنی ہیں۔'' (ص ۱۲)

حضرت مولانا شہید کا یہ رسالہ اصول فقہ درحقیقت اصول فقہ کی تہذیب ہے۔ (۱)۔اس میں فن کے بڑے بڑے مسئلوں کو ایک ایک دو دو فقروں میں طے فرما دیا ہے' اوپر کی عبارت میں مصنف نے جو کچھ کہا ہے اس کی تشریح یہ ہے کہ'' قانون کا واضع درحقیقت اللہ تعالیٰ ہے'' یہ حق مخلوقات میں سے کسی کے لیئے ثابت نہیں ہے جو کچھ اللہ تعالیٰ نے امر و نہی فرمایا ہے وہ تمام عقلی بھی کہہ سکتے ہیں' ورنہ عقلی کہنے کا یہ منشا نہیں کہ عقل اس قانون کی واضع اور آمر ہے۔

اس تفصیل کی ضرورت اس لیئے پیش آئی تا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ ہمارے ماہرین قانون نے شروع سے آخیر تک اس اصول کو مان لیا ہے کہ اسلام میں وضع قانون کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے' وہی ایک حاکم' آمر اور واضع شرع ہے۔

اس موقع پر بعض صاحبوں کو یہ شبہہ پیش آئے گا کہ یہ قانون شرع تو کسی قدیم زمانہ میں ایک وقت خاص میں نازل ہوا' وہ زمانہ کی ہر ضرورت اور نت نئے حالات کے مناسب قیامت تک کے لیئے کیوں کر ہو سکتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ایک ہیں قانون کے اصول' اور کلیات اور دوسرے ہیں اس کے فروع اور جزئیات' دنیا کے ہر

قانون کے اصول وکلیات خواہ وہ عقلی اور تجربی ہوں، ہمیشہ یکساں رہتے ہیں، ان میں تغیر وتبدل نہیں ہوتا، اور تجدد یعنی نئی نئی صورتوں کا پیش آنا، یہ واقعات اور حوادث میں ہوتا ہے جو انہی کلیات کے اندر مندرج ہوتے ہیں، جیسے فن طب جب بھی بنا ہو لیکن اس کے اصول وکلیات پرانے اور غیر مبدل ہیں، اب جو بھی بیماریاں ظاہر ہوں، قدیم اصول کے تحت ان کا بیان طب کی کتابوں میں موجود ہے، مثال کے لیئے یوں سمجھئے کہ قتل ناحق کی سزا قصاص، دیت اور کفارہ وغیرہ شرع میں مقرر ہے، اب یہ بات کہ قتل پہلے تیر اور تلوار سے ہوتا تھا اور اب بندوق سے، پنچہ سے، ریوالور سے، توپ سے، گولہ سے اور مختلف نئے نئے اوزاروں سے ہوتا ہے لیکن ذرائع قتل کا تغیر نفس مسئلہ کی صورت میں کوئی فرق نہیں پیدا کرتا، کسی کی سواری سے کسی کو نقصان پہنچ جائے تو اس کا اصولی جواب شرع میں موجود ہے، پہلے یہ سواری جانوروں کی صورت میں محدود تھی، اور اب طرح طرح کی گاڑیوں، سائیکلوں، سکوٹروں، موٹروں، ریلوں وغیرہ کی صورت میں ہے، ان سے حادثے پیش آجائیں، یا نقصان پہنچ جائے تو اصول کلیہ میں کوئی فرق نہ ہوگا۔

(۱)۔تہذیب منطق میں ایک مختصر متن متین کا نام ہے جس میں بڑے بڑے فیصلوں کو جن پر مباحث کے دفتر ہیں ایک ایک فقرہ میں ادا کر دیا گیا۔

دوسرا شبہہ یہ پیش آسکتا ہے کہ اگر یہ اصول صحیح ہے تو ہر زمانہ کے مجتہد نئے نئے حالات کے پیش نظر اپنے اجتہاد سے جو حکم دیتے ہیں، کیا وہ نیا حکم نہیں ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ مجتہد وہ ہیں جو احکام کے اصول وفرع پر پوری نظر رکھتے ہوں، آیات واحادیث سے احکام کے اصول کلی اور ان کے علل واسباب اور مصالح ومقاصد کو جانتے ہوں اور ان کے مطابق نئی پیش آنے والی جزئی صورتوں کا فیصلہ کرتے ہوں اس بنا پر ان کا اجتہاد اور قیاس کسی نئے حکم کا واضح اور مخترع نہیں، بلکہ مظہر ہے، یعنی وہ حکم کا اختراع نہیں کرتے بلکہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ مقررہ احکام الٰہی

کے تحت اس نئی صورت کا یہ جواب ہے' اہل اصول کے اس مسئلے کے قیاس حکم کا صرف مظہر ہے' یہی معنی ہیں کہ وہ بتاتا ہے کہ یہ نیا جزیہ فلاں اصول کلی کی ماتحت انہی اصولوں کی بنا پر ہمارے فقہا نے فتاوی کا پورا دفتر مرتب کیا ہے' جس کے مطابق ہر زمانہ میں ہر ضرورت کا جواب دیا جا سکتا ہے اور جس پر دنیا کے مختلف حصوں میں مسلمانوں کی عظیم الشان حکومتیں اور عدالتیں قائم ہوئیں اور اب بھی قائم ہیں۔

-------ختم شد-------جلد ہفتم-------

تمام شد

IqbalCyberLibrary.Net All rights reserved. ©2002-2006